ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

www.tahqeeqat.net

ISSN:2321-8339

اپریل — جون ۲۰۱۳ء

- اسپرم بینک: تصور، مسائل اور اسلامی نقطۂ نظر

  محمد رضی الاسلام ندوی

- سابقہ شریعتوں سے استدلال اور امام بخاری کا موقف

  جناب عبدالغفار

- حکمرانوں کا عدالتی استثناء (اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک جائزہ)

  جناب مقبول حسن

- مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مجلس احرار اسلام

  ڈاکٹر محمد عرفان قاسمی

- راغب اصفہانیؒ اور فراہیؒ کے اصول تاویل کا تقابلی مطالعہ

  ڈاکٹر محمد یوسف الشرقی / مولانا ابو سعد اعظمی

- غیبت۔ بدکاری سے زیادہ سنگین جرم؟

  ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف

- تہذیب و سیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار (سمینار رپورٹ)

  ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی

- تعارف و تبصرہ

  محمد رضی الاسلام ندوی

  مولانا محمد جرجیس کریمی

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل ــــــــــــــ جون ۲۰۱۴ء

مدیر

سید جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۳ شمارہ: ۲

جمادی الاخریٰ ——— شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ

اپریل ——— جون ۲۰۱۴ء

تحقیقاتِ اسلامی کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر ملاحظہ کریں

ادارتی امور

موبائل : 09582050234

ای میل: tahqeeqat@gmail.com

mrnadvi@yahoo.com

انتظامی امور

فون : 0571-2902034

موبائل: 09897655171

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com

tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۴۰ روپے
سالانہ	۱۵۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۶۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۲۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور) علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

اسپرم بینک: تصور، مسائل اور اسلامی نقطۂ نظر — محمد رضی الاسلام ندوی — ۵

تحقیق وتنقید

سابقہ شریعتوں سے استدلال اور امام بخاریؒ کا موقف — جناب عبد الغفار — ۲۵

بحث ونظر

حکم رانوں کا عدالتی استثناء (اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک جائزہ) — جناب مقبول حسن — ۳۹

سیر وسوانح

مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ اور مجلس احرارِ اسلام — ڈاکٹر محمد عرفان قاسمی — ۵۵

ترجمہ وتلخیص

امام راغب اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کے اصول تاویل کا تقابلی مطالعہ — ڈاکٹر محمد یوسف الشربجی، مترجم: مولانا ابوسعد اعظمی — ۷۵

نقد واستدراک

غیبت - بدکاری سے زیادہ سنگین جرم؟ — ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف — ۹۷

رپورٹ سمینار

تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار — ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی — ۱۰۳

تعارف وتبصرہ

توضیحی اشاریہ تفسیر تدبر قرآن — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۳

حدیث اور علوم حدیث - مختصر تعارف — ” ” — ۱۱۵

جنائز (میت کے جامع مسائل) — ” ” — ۱۱۵

افکار مجیب — ” ” — ۱۱۶

عرب وہند کی علمی وادبی خدمات — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۸

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۵۱) — ۱۱۹

مضامین کا انگریزی خلاصہ — ” ” — ۱۲۱ - ۱۲۸

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ جناب عبد الغفار

سبجیکٹ اسپیشلسٹ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج فار ایلیمنٹری ٹیچرس، کوٹ لکھپت، لاہور (پاکستان) dr.abdulghaffar01@gmail.com

۲۔ جناب مقبول حسن

صدر شعبۂ اسلامیات، بحریہ کالج کارساز، کراچی (پاکستان)
maqboolhassan313@gmail.com

۳۔ ڈاکٹر محمد عرفان قاسمی

شعبۂ دینیات (سنّی) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
drirfantauheed@gmail.com

۴۔ ڈاکٹر محمد یوسف الشربجی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تفسیر وعلوم القرآن، فیکلٹی آف شریعہ وقانون، متحدہ عرب امارات یونی ورسٹی

۵۔ مولانا ابوسعد اعظمی

ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
anislahi@gmail.com

۶۔ ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامیات، عبدالولی خاں یونی ورسٹی، مردان (پاکستان)
sirajulislam@awkum.deu.pk

۷۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی

استاد، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
ziauddin.malik.falahi@gmail.com

۸۔ مولانا محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ
Jarjees.karimi@yahoo.com

۹۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

اسپرم بینک
تصور، مسائل اور اسلامی نقطۂ نظر

محمد رضی الاسلام ندوی

عصر حاضر میں میڈیکل سائنس کے میدان میں غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقیات نے سماجی سطح پر بعض ایسے مسائل کھڑے کردیے ہیں، جن سے نظامِ خاندان بری طرح شکست و ریخت سے دوچار ہے اور اس کے تانے بانے بکھر کر رہ گئے ہیں۔ ان میں حیوانات منویہ کی ذخیرہ اندوزی (Sperm Bank)، ان کا عطیہ (Sperm Donation) اور ان کے ذریعے مصنوعی تلقیح (Artificial insemination) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اسپرم بینک سے مراد وہ طبی مراکز ہیں جو عطیہ دہندگان (Donors) کا نطفہ حاصل کرتے ہیں اور مخصوص تکنیک کے ذریعے ان سے حیواناتِ منویہ الگ کرکے اور انھیں منجمد کرکے اپنے یہاں محفوظ کرلیتے ہیں، تاکہ بعد میں کوئی بھی عورت، جو بچہ چاہتی ہے، انھیں وہاں سے حاصل کرکے، ان کے ذریعے مصنوعی طور پر بار آور ہوجائے اور حمل کی مخصوص مدت گزرنے کے بعد بچہ کو جنم دے۔ اسپرم بینک کا آغاز چار دہائیوں قبل مغرب میں ہوا، لیکن اس مختصر عرصے میں پوری دنیا میں اسے قبولِ عام حاصل ہوا ہے اور بیش تر ممالک میں یہ مراکز قائم ہوچکے ہیں۔

فطری طریقۂ تولید اور اس میں نقائص

اسپرم بینک کا وجود فطری طریقۂ تولید میں پائے جانے والے بعض نقائص کے ازالے کے لیے ہوا ہے۔ نسل انسانی کے استمرار وتسلسل کے لیے قدرت نے مرد اور عورت کے جنسی اتصال کو ذریعہ بنایا ہے۔ دونوں کے اعضائے تناسل سے سیّال مادے

نکلتے ہیں۔ مرد کے خصیہ (Testes) میں اربوں حیواناتِ منویہ (Sperm) پائے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ کے انزال (Ejaculation) میں مرد کے عضو سے جو سیال مادہ (نطفہ/ Semen) نکلتا ہے، اس میں حیواناتِ منویہ کی تعداد 40 million سے 1.2 billion تک ہوتی ہے۔ عورت کے خصیۃ الرحم (Ovaries) میں تقریباً 2 million کیساتِ بیضیہ (Follicles) ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف چار سو پچاس (۴۵۰) ہی پوری عمر میں پختہ بیضہ (Mature Eggs) کے اخراج کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہر ماہ خصیۃ الرحم سے ایک بیضہ کا اخراج (Ovulation) ہوتا ہے۔ جنسی تعلق کے نتیجے میں مرد کے حیواناتِ منویہ (Sperm) میں سے ایک کا عورت کے اعضاء تناسل میں قاذفین (Fallopian Tubes) میں سے ایک میں اس کے بیضہ (Ovum) سے اتصال و امتزاج ہوتا ہے۔ اس طرح عملِ بارآوری (Fertilization) انجام پاتا ہے۔ یہ بارآور بیضہ بہت سے خلیوں میں تقسیم ہوتا ہوا اور مختلف مراحل سے گزرتا ہوا رحم (Uterus) میں اتر آتا ہے اور بارآوری کے چھٹے دن مستبطن الرحم (Endometrium) میں چپک جاتا ہے، پھر نشو ونما پاتے ہوئے جنین (Foetus) کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ا؎

جنسی اعضاء میں سے کسی عضو میں کوئی نقص ہو تو بارآوری اور تولید کا عمل انجام نہیں پاسکتا۔ یہ نقص عورت میں بھی ہوسکتا ہے اور مرد میں بھی۔ عورت میں نقص کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً خصیۃ الرحم میں کسی نقص کے سبب اس سے بیضہ کا اخراج ممکن نہ ہو، یا قاذفین پیدائشی طور پر موجود نہ ہوں یا مسدود ہوگئے ہوں، یا عورت پیدائشی طور پر رحم سے محروم ہو، یا کسی مرض کے سبب اس میں بارآور بیضہ کا استقرار ممکن نہ ہو۔ مرد میں نقص کی یہ صورتیں ہوسکتی ہیں کہ وہ قوتِ مردمی میں کمی کے سبب جماع پر قادر نہ ہو، یا اس کے نطفہ میں حیواناتِ منویہ کی تعداد کم اور ان کی حرکت کم زور ہو، یا نطفہ کو خصیوں سے عضوِ تناسل تک لانے والی رگیں مسدود ہوں، یا خصیے بے کار ہوں اور ان میں حیواناتِ منویہ کی پیدائش نہ ہو رہی ہو۔ ۲؎

مصنوعی تلقیح کے میدان میں میڈیکل سائنس کی ترقیات

ان نقائص میں سے بعض خِلقی ہیں تو بعض اکتسابی (Acquired)۔ ان کے

علاج معالجہ کے سلسلے میں مغرب میں میڈیکل سائنس نے غیر معمولی ترقی کی ہے اور ان کے ازالے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی ہیں۔ مثلاً:

- اگر عورت میں قاذفین سرے سے موجود نہ ہوں، یا کسی وجہ سے مسدود ہو گئے ہوں، جس کی بنا پر مرد کے نطفے سے عورت کے بیضے کا اتصال اور بارآوری، پھر رحم میں اس کی تنصیب نہ ہو پا رہی ہو تو عورت کا بیضہ اور مرد کا نطفہ حاصل کر کے دونوں کو ایک ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو 'ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری' In Vitro Fertilization (IVF) کہا جاتا ہے۔ پھر اس بارآور بیضہ کو ایک متعین مدت کے بعد عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

- اگر کسی نقص کے سبب عورت کے خصیۃ الرحم سے بیضہ خارج نہ ہو پا رہا ہو، لیکن اس کا رحم بالکل ٹھیک اور استقرارِ حمل کی صلاحیت رکھتا ہو تو کسی دوسری عورت کا بیضہ لے کر اس کے رحم میں منتقل کیا جاتا ہے، یا شوہر کے نطفے سے دوسری عورت کا بیضہ اسی کے رحم میں بارآور کر کے، یا دونوں کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کر کے اس بارآور بیضہ کی تنصیب بیوی کے رحم میں کر دی جاتی ہے۔ اسے 'انتقال بیضہ' (Ovum Implantation) کہا جاتا ہے۔

- اگر مرد نطفہ اور عورت بیضہ فراہم کر سکتی ہے، لیکن عورت رحم کے کسی مرض میں مبتلا ہو، جس کی وجہ سے اس میں استقرار حمل نہ ہو سکتا ہو، یا وہ حاملہ ہونا نہ چاہتی ہو تو زوجین کسی دوسری عورت کے رحم کو کرایے پر لیتے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب میں دونوں کے مادوں کا ملاپ کر کے حاصل شدہ جنین کو اس عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور ولادت کے بعد اس بچے کو زوجین کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بیوی سے بیضہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ شادی شدہ جوڑا اولاد کے لیے کسی دوسری عورت کی خدمات حاصل کرتا ہے، تاکہ شوہر کا نطفہ اس کے بیضے سے مل کر بہ صورت جنین اس کے رحم میں پرورش پائے۔ ان دونوں صورتوں کو 'قائم مقام مادریت' (Surrogacy) کا نام دیا گیا ہے۔

- اگر مرد کا نطفہ حیاتیاتی اعتبار سے صحت مند ہو اور اس میں تولیدی صلاحیت موجود ہو، لیکن وہ قوتِ مردمی میں کمی کے سبب جماع پر قادر نہ ہو، یا اس کے خصیوں سے

عضوِ تناسل تک نطفہ کو لانے والی رگیں مسدود ہوگئی ہوں تو اس کا نطفہ ایک سرنج میں لے کر عورت کے قناۃ عنق الرحم (Cervical Canal) کے ذریعے رحم میں پہنچادیا جاتا ہے، جہاں عورت کا بیضہ اس سے مل کر بارآور ہوجاتا ہے۔ اس طریقہ کو 'مصنوعی تلقیح' (Artificial Insemination) کہا جاتا ہے۔

۔ اگر مرد کے نطفہ میں حیواناتِ منویہ کا تناسب کم اوران کی حرکت کم زور ہو، یا وہ تولیدی صلاحیت سے بالکل محروم ہوتو عورت کو بارآور کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص کا نطفہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے لے کر عورت کے بیضے کے ساتھ مصنوعی تلقیح کی جاتی ہے، پھر اسے عورت کے رحم میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ اسے 'عطیۂ حیوانِ منوی' (Sperm Donation) کہا جاتا ہے۔[۳]

مصنوعی تلقیح اوراسپرم بینک

مصنوعی تلقیح شوہر کے نطفے سے بھی ممکن ہے اور کسی اجنبی مرد کے نطفے سے بھی۔ اجنبی مرد کے نطفے سے مصنوعی تلقیح کا تجربہ پہلی مرتبہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں کیا گیا۔

۱۹۰۹ء میں امریکن جرنل Medical World میں ڈاکٹر ایڈیسن ڈیوس ہارڈ (Addison Davis Hard) کا ایک مراسلہ شائع ہوا، جس میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ پچیس سال قبل ۱۸۸۴ء میں جیفرسن میڈیکل کالج فیلاڈلفیا میں پروفیسر ولیم پن کوسٹ (Prof. William Pancoast) نے عطیۂ حیوانِ منوی کے ذریعے مصنوعی تلقیح کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ یہ تجربہ ایک ایسی عورت پر کیا گیا جو ڈاکٹر ولیم کی مریضہ تھی۔ اس کے بارے میں اس کے شوہر نے بتایا کہ شادی کے کافی دن گزر جانے کے باوجود اسے بچہ نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے عورت کے تمام ٹیسٹ کیے، لیکن وہ ہر لحاظ سے نارمل نکلی۔ شوہر کا ٹیسٹ ہوا تو اس کے نطفے میں حیواناتِ منویہ اتنے کم پائے گئے کہ ان کے ذریعے استقرارِ حمل ناممکن تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے طلبہ کے سامنے یہ کیس رکھا تو ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ کلاس کے سب سے اسمارٹ لڑکے کا نطفہ لے کر اس کے ذریعہ عورت کو بارآور کردیا جائے۔ یہ تجربہ کیا گیا اور جب تک یہ یقین نہیں ہوگیا کہ اس کے ذریعے عورت حاملہ ہوگئی

ہے، اس کے شوہر کو کچھ نہیں بتایا گیا۔ جب شوہر کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا، لیکن اس نے درخواست کی کہ عورت کو یہ باتیں ہرگز نہ بتائی جائیں۔

اس واقعہ سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس وقت تک مغرب میں بھی شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے نطفے سے عورت کا حاملہ ہونا سماج میں قابلِ نفرت سمجھا جاتا تھا۔ یہ صورتِ حال بیسویں صدی کے وسط تک برقرار رہی۔ قانونی طور پر بھی اس کی اجازت نہیں تھی۔ ۱۹۵۴ء میں امریکا میں Cook Country کی سپریم کورٹ نے ایک کیس میں زوجین کے درمیان اس وجہ سے علیٰحدگی کروادی کہ بیوی نے شوہر کی اجازت کے بغیر اجنبی مرد کے نطفے سے مصنوعی تلقیح کروائی تھی۔ عدالت نے یہ رولنگ دی کہ مصنوعی تلقیح سے ہونے والا بچہ چوں کہ نکاح کے دائرے سے باہر پیدا ہوا ہے، اس لیے یہ عمل غیر قانونی اور جرم ہے۔ اٹلی میں اسقفِ اعظم نے اسے گناہ قرار دیا اور مشورہ دیا کہ جو شخص اسے انجام دے اسے جیل بھیج دیا جائے۔ ۱۹۶۳ء میں امریکہ کی ایک عدالت نے فیصلہ دیا کہ مصنوعی تلقیح سے بچہ پیدا کرنا غیر قانونی ہے۔ اس لیے کہ اس میں اجنبی شخص کا حیوانِ منوی استعمال کیا جاتا ہے، جس سے عورت رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہوتی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس رجحان میں تبدیلی آنے لگی۔ ۱۹۶۴ء میں جارجیا پہلی ایسی امریکی ریاست ٹھہری جہاں مصنوعی تلقیح سے ہونے والی پیدائش کو قانونی حیثیت دی گئی، اس شرط کے ساتھ کہ اس کے لیے شوہر اور بیوی دونوں نے تحریری طور پر اجازت دی ہو۔ ۱۹۷۳ء میں کمشنرس آف یونی فارم اسٹیٹ لاز نے اور ایک سال کے بعد امریکن بار ایسوسی ایشن نے Uniform Parentago Act منظور کیا۔ اس کے مطابق اگر کسی عورت کی کسی اجنبی مرد کے حیوانِ منوی سے مصنوعی تلقیح اس کے شوہر کی اجازت سے ہوتی ہے تو حیوانِ منوی کا عطیہ دینے والے کو قانونی حقوق حاصل نہیں ہوں گے اور شوہر ہی کو اس بچے کا باپ سمجھا جائے گا۔

مصنوعی تلقیح تازہ اسپرم کے ذریعے بھی ممکن ہے اور منجمد اسپرم کو دوبارہ طبعی حالت پر لا کر بھی۔ منجمد اسپرم کے ذریعے مصنوعی تلقیح کا تصور سب سے پہلے اٹلی کے مشہور

ڈاکٹر Montegazza نے ۱۸۶۶ء میں پیش کیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ جو شخص میدانِ جنگ میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے جارہا ہو اسے چاہیے کہ گھر پر اپنا اسپرم منجمد اور محفوظ کر کے جائے، تاکہ اگر وہ جنگ میں کام آجائے یا وہاں سے معذور ہو کر واپس لوٹے تو حسبِ ضرورت اس کا قانونی وارث جنم لے سکے۔ لیکن یہ تصور نصف صدی کے بعد عملی جامہ پہن سکا۔

اسپرم بینک کا آغاز وارتقاء

۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیانی عرصے میں سائنس دانوں نے دیکھا کہ اسپرم منجمد اور محفوظ کیے جانے کے دوران منفی ۳۲۱ ڈگری فارن ہائٹ تک کا درجۂ حرارت برداشت کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں امریکی سائنس داں پارکس (A.S. Parkes) نے دو برطانوی سائنس دانوں کے ساتھ مل کر ایک اہم دریافت کی۔ انھوں نے گلیسرول نامی رقیق محلول تیار کیا، جو اسپرم کو منجمد کرنے کے دوران اسے جراحت سے بچاتا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں امریکن سائنس داں ڈاکٹر جیروم شیرمن (Dr. Jerome K. Sherman) نے اس میں مزید بہتری پیدا کی اور پہلی مرتبہ منجمد اسپرم کے ذریعے عورت کے بیضہ کی بار آوری کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس کا باقاعدہ اعلان دس سال کے بعد ۱۹۶۳ء میں 11th International Congress of Genetics میں کیا گیا۔ اس طرح اسپرم بینک کے امکانات میں دل چسپی لی جانے لگی۔ اس کے تقریباً ایک دہائی کے بعد ۱۹۷۱ء میں پہلا کمرشیل اسپرم بینک (Minnesota(Roseville میں قائم ہوا۔

اسپرم بینک کو Cryobank بھی کہا جاتا ہے۔ Cryo یونانی لفظ Kryos سے نکلا ہے، جس کے معنیٰ 'پالا' (Frost) کے ہیں۔ اس بنا پر اسپرم بینک کا اطلاق ان طبی مراکز پر ہوتا ہے جہاں انسانی نطفہ میں پائے جانے والے حیوانات منویہ کو منجمد کر کے محفوظ کیا جاتا ہے، تاکہ آئندہ وقتِ ضرورت دوبارہ انھیں طبعی حالت پر واپس لا کر ان کے ذریعے استقرارِ حمل کروایا جاسکے۔ اسپرم کو کتنی مدت تک منجمد رکھا جاسکتا ہے؟ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ برطانیہ میں اسپرم کے ایک نمونہ کو اکیس (۲۱) سال تک منجمد رکھنے کے بعد اس سے

استقرارِ حمل کروایا گیا۔

ابتدا میں اسپرم بینکوں کی توجہ زیادہ تر ان مردوں کو سہولت فراہم کرنے پر تھی، جن میں بعض عوارض و اسباب سے نامردی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً بعض مرد نس بندی کے ذریعے اپنی تولیدی صلاحیت ختم کرا لیتے ہیں۔ اسی طرح کینسر یا بعض دیگر امراض میں سرجری ضروری ہو جاتی ہے، یا بعض امراض میں کیمیاوی علاج (Chemotherapy) یا تابکاری (Radiation) کے ذریعہ علاج کیا جاتا ہے۔ ان صورتوں میں تولیدی صلاحیت ختم ہو سکتی ہے۔ اسپرم بینکوں کے ذریعے مردوں کو یہ سہولت حاصل ہوئی کہ وہ مذکورہ علاج کرانے سے قبل اپنے اسپرم کے نمونے ان مراکز میں جمع کرا دیں، تاکہ بعد میں اگر انھیں اولاد کی خواہش ہو تو ان کے ذریعے اپنے جوڑوں میں مصنوعی تلقیح کروا سکیں۔ لیکن ساتویں دہائی کے آخر میں Wisconsin University میں محققین اور معالجین کے ذریعے ہونے والے ایک سروے کے بعد یہ مرکز توجہ (Focus) تبدیل ہو گیا۔ اس سروے میں بتایا گیا کہ امریکا میں 3.5 million بانجھ جوڑوں میں سے تقریباً نصف میں بانجھ پن کا سبب مردوں میں تھا اور یہ کہ اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں میں سے خاصی بڑی تعداد اجنبی مردوں کے تازہ نطفے کے ذریعے مصنوعی تلقیح کرتی تھی۔ یہ نطفے وہ میڈیکل اسٹوڈینٹس یا اسپتال کے عملہ سے حاصل کرتے تھے۔ اس سروے کی اشاعت کے بعد مجہول عطیہ دہندگان کے اسپرم کی طلب بڑھ گئی اور اس کی تکمیل اسپرم بینکوں کا ہدف بن گیا۔

ابتدا میں ڈاکٹر منجمد اسپرم کے استعمال کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ استقرارِ حمل کے سلسلے میں منجمد اسپرم کے مقابلے میں تازہ اسپرم زیادہ کارگر ہے۔ لیکن آٹھویں دہائی کے وسط سے AIDS نامی موذی مرض کے انکشاف کے نتیجے میں منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔ HIV, Hepatitis یا دیگر متعدی جنسی بیماریوں (Sexual Transmitted Diseases STD) کے اندیشے کے سبب American Association of Tissue Bank نے اپنے ممبر بینکوں کو تاکید کی کہ وہ تازہ اسپرم کا استعمال نہ کیا

کریں۔ ۱۹۸۸ء میں امریکہ میں صحتی نگہہ داشت کے اداروں (1) American Fertility Society (2) Food & drugs Administration (3) Centre for disease Control نے بھی تجویز دی کہ مصنوعی تلقیح کے لیے اجنبی مردوں کے صرف منجمد اسپرم استعمال کیے جائیں۔

موجودہ دور میں اسپرم بینکوں کا دائرہ اور طریقہ کار

مغرب میں اسپرم بینکوں سے تین طرح کی خواتین استفادہ کرتی ہیں:

۱۔ وہ شادی شدہ خواتین جن کے شوہر کسی وجہ سے تولیدی صلاحیت سے محروم ہوں۔

۲۔ ہم جنسیت میں مبتلا خواتین (Lesbians)۔

۳۔ وہ خواتین جن کا نکاح نہ ہوا ہو، لیکن وہ ماں بننا چاہتی ہوں (Single Parents)۔

ان خواتین کو اختیار رہتا ہے کہ وہ اسپرم بینک سے ایسے مجہول افراد کا اسپرم لیں جنھیں اپنی خاندانی زندگی کا جزنہ بنانا چاہتی ہوں، یا ایسے افراد کا اسپرم حاصل کریں جن سے بعد میں وہ خود یا پیدا ہونے والا بچہ بالغ ہونے کے بعد رابطہ کرسکیں۔

یہ خواتین عموماً اسپرم حاصل کرکے خود اپنے اندر مصنوعی تلقیح کرواتی ہیں اور استقرارِ حمل کے بعد متعینہ ایام گزرنے پر بچے جنتی ہیں۔ کچھ خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جو حمل کے لیے کسی دوسری عورت کا رحم کرایے پر لیتی ہیں۔ بیضہ بچہ چاہنے والی عورت کا ہوتا ہے اور اسپرم عطیہ دینے والے مرد کا۔ دونوں کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کرکے کرایے کے رحم میں منتقل کردیا جاتا ہے، جس میں استقرارشدہ جنین کی پرورش ہوتی ہے۔

بعض بینک اسپرم حاصل کرنے والی خواتین کو آئندہ ہونے والے بچے کی جنس کے انتخاب کی بھی سہولت فراہم کرتے ہیں۔ سائنسی طور پر یہ بات معلوم و متحقق ہے کہ اسپرم میں Y Chromoseme لڑکے (Male) کی پیدائش کے ذمے دار ہوتے ہیں، جب کہ X Chromosome سے لڑکی (Female) پیدا ہوتی ہے۔ X اور Y کروموزوم کو الگ الگ کرنے کے لیے اسپرم بینک 'طریقۂ سباحت' (Swimup Method) اختیار

کرتے ہیں۔ٹیسٹ ٹیوب میں تازہ حاصل کیے گئے اسپرم کے ساتھ Sperm Extender شامل کرکے چھوڑ دیا جاتا ہے۔نصف گھنٹے کے بعد Y کروموزوم، جو ہلکے ہوتے ہیں، اوپر تیرنے لگتے ہیں، جب کہ X کروموزوم، جو بھاری ہوتے ہیں، نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔اولاً جنس کی تعیین میں یہ طریقہ سو فی صد کامیاب نہیں ہے، ثانیاً بعض ممالک میں قانونی طور سے اس پر پابندی عائد ہے۔

اسپرم بینکوں میں اپنے اسپرم کا عطیہ دینے والے بعض افراد رفاہی جذبے سے ایسا کرتے ہیں، جب کہ بعض اپنے عطیے کا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔نو (۹) ملکوں میں عطیۂ حیوان منوی (Sperm Donation) پر ہونے والے انتیس (۲۹) مطالعات (Studies) کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ عطیہ دہندہ کو ایک انزال (Ejaculation) پر دس (۱۰) ڈالر سے ستر (۷۰) یورو تک ملتے ہیں۔ نیویارک میں واقع Cryos International Sperm Bank سے رابطہ رکھنے والے عطیہ دہندگان کے درمیان ہونے والے سروے سے معلوم ہوا کہ عطیہ کے مذکورہ بالا دو ہی مقاصد اہم ہیں۔اس اسپرم بینک میں عطیہ پر جو معاوضہ طے تھا، ۲۰۰۴ء میں اس میں سو فی صد اضافہ کر دیا گیا، لیکن نہ نئے عطیہ دہندگان نے رجوع کیا نہ پرانے عطیہ دہندگان کے عطیوں کی تعداد (Frequency) میں اضافہ ہوا۔ایک سال کے بعد معاوضہ کی سابقہ شرح بحال کر دی گئی، تب بھی دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔نہ عطیہ دہندگان کی تعداد کم نہ ہوئی اور ان کی باریوں میں کمی آئی۔

جو افراد اسپرم بینک کو اپنے اسپرم کا عطیہ دیتے ہیں وہ ان بچوں کی کوئی قانونی ذمہ داری نہیں لیتے جو ان کے اسپرم سے پیدا ہوئے ہوں۔اس سلسلے میں اسپرم بینک اپنے عطیہ دہندگان سے باضابطہ معاہدہ (Agreement) کر لیتے ہیں۔

اسپرم بینک میں بعض شادی شدہ افراد بھی اپنا اسپرم محفوظ کرواتے ہیں، مثلاً وہ فوجی جو محاذِ جنگ پر جا رہے ہوں (خلیجی جنگ میں بہت سے امریکی فوجیوں نے یہ کام کیا)، یا کینسر وغیرہ کے وہ مریض جو اپنا کیمیاوی علاج (Chemotherapy) کروا رہے ہیں۔

اسپرم بینک عطیہ پر ابھارنے کے لیے پبلسٹی کے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کرتے

ہیں، خاص طور پر وہ اس کام کے لیے انٹرنیٹ اور Gay & Lesbian Publications کا سہارا لیتے ہیں۔عموماً اٹھارہ (۱۸) سے پینتالیس (۴۵) سال کے درمیان کی عمر کے افراد کا اسپرم حاصل کیا جاتا ہے۔ جو افراد ان سے رجوع کرتے ہیں ان کا بہت تفصیل سے معاینہ (Checkup) کیا جاتا ہے کہ وہ موروثی امراض (Genetic Diseases) ، کروموسوم سے متعلق نقائص (Chromosomal Abnormalities) یا اسپرم کے ذریعے منتقل ہونے والے متعدی امراض (Sexual Transmitted infections) کا شکار تو نہیں ہیں۔ اگر وہ صحت مند ہوں تو ان کے اسپرم کا نمونہ لے کر اس کی بھی خورد بینی حیاتیاتی جانچ (Microbiological test) کی جاتی ہے کہ اس میں متحرک حیواناتِ منویہ کی تعداد کیا ہے؟ ان میں تولیدی صلاحیت کتنی ہے؟ عملِ انجماد کے دوران وہ زندہ رہ پائیں گے یا نہیں؟ وغیرہ۔ پھر مخصوص تکنیک سے اسے منجمد کر کے چھ ماہ کے لیے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اسے 'وقفۂ قرنطینۂ' (Quarantine Period) کہا جاتا ہے۔ یہ وقفہ گزرنے کے بعد عطیہ دہندہ کا دوبارہ ٹیسٹ یہ جاننے کے لیے کیا جاتا ہے کہ اسے کوئی انفیکشن تو نہیں ہے۔ نتیجہ منفی ہونے کی صورت میں اس کے سپرم کو مصنوعی تلقیح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اسپرم بینک عطیہ دہندگان کے بارے میں مکمل معلومات محفوظ رکھتے ہیں۔ مثلاً نسل، تعلیم، قد، ہیئت، جلد کی رنگت، آنکھوں کا رنگ، بلڈ گروپ وغیرہ۔ ان میں سے کچھ معلومات انٹرنیٹ پر دست یاب ہوتی ہیں اور کچھ ان افراد کو بہ راہ راست دی جاتی ہیں جو اسپرم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض خواتین ایک ہی عطیہ دہندہ کے اسپرم سے ایک سے زیادہ بچے پیدا کرنا چاہتی ہیں تو اسپرم بینک اس کی بھی سہولت فراہم کرتے ہیں۔ امریکہ کے شہر اسکینڈیڈو، کیلی فورنیا میں ۱۹۸۰ء میں ایک اسپرم بینک Respository for Germinal Choice کے نام سے قائم ہوا تھا، یعنی عمدہ نطفہ کا مرکز۔ (تقریباً دو دہائیوں کے بعد یہ مرکز اپنے بانی Robart Graham کی وفات کے بعد بند ہوگیا)۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ نوبل انعام یافتہ افراد سے ان کے نطفے حاصل کرکے انھیں محفوظ کرتا

اور اعلیٰ ذہانت کی حامل ایسی خواتین کو، جن کے شوہر تولیدی صلاحیت سے محروم ہوں، مصنوعی تلقیح کے لیے پیش کرتا ہے۔

اسپرم بینک کے صحیح اور منظم طریقے سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے مختلف ممالک میں قواعد وضوابط وضع کیے گئے ہیں۔ مثلاً بعض ممالک میں مجہول عطیہ دہندگان کے اسپرم استعمال کرنے پر پابندی ہے۔ بعض ممالک غیر شادی شدہ عورت کو عطیۂ حیوانِ منوی کے ذریعے مصنوعی تلقیح کی اجازت نہیں دیتے۔ بعض ممالک نے یہ تعداد متعین کردی ہے کہ اسپرم کے ایک عطیہ سے زیادہ سے زیادہ کتنے بچے پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے خواست گاران اپنی مطلب براری کے لیے دیگر ممالک کا سفر کرتے ہیں، جہاں اس کی اجازت ہے۔ اسے 'تولیدی سیاحت' (Fertility Tourism) کا نام دیا گیا ہے۔ بعض اسپرم بینک اپنے یہاں محفوظ اسپرم کو تولیدی علاج (Fertility Treatment) کے علاوہ دیگر کاموں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً وہ زائد از ضرورت نمونوں کو اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک دیگر اسپرم بینکس کو فروخت کردیتے ہیں۔ بعض بینک اسپرم کو قابلِ استعمال بنانے (Processing)، محفوظ کرنے اور سپلائی کرنے کو بزنس بنالیتے ہیں۔ بعض بینک تعلیمی اور تحقیقی مقاصد سے، متعلقہ اداروں کو اسپرم فراہم کرتے ہیں۔ اس چیز نے موجودہ دور میں بین الاقوامی تجارت کی شکل اختیار کرلی ہے، جس میں دنیا بھر کے ممالک شریک ہیں۔ ڈنمارک دنیا کا ایسا ملک ہے جو سب سے زیادہ اسپرم ایکسپورٹ کرتا ہے۔

اسپرم بینک ۔ مغربی کلچر کی دین

بانجھ پن اور تولیدی صلاحیت سے محرومی یوں تو صحت عامہ کے ایسے مسائل ہیں جو پوری دنیا میں عام ہیں، لیکن خاص طور سے انھوں نے مغربی ممالک میں خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کا بنیادی سبب وہ کلچر اور طرزِ معاشرت ہے جو مغرب کی پہچان بن گیا ہے۔ وہاں عورتوں کو بے محابا آزادی حاصل ہے۔ اباحیت عروج پر ہے۔ جنسی تسکین کے لیے کوئی بھی ذریعہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ صنفِ مخالف سے جنسی تعلق اگر

زور زبردستی قائم کیا جائے تب تو وہ جرم اور قابلِ تعزیر ہے، لیکن اگر اس میں دونوں فریقوں کی مرضی شامل ہو تو اس پر کوئی روک ٹوک اور قید نہیں۔ حتّٰی کہ خلافِ وضعِ فطرت جنسی اعمال کو بھی قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے۔ کسی چیز کا ضرورت سے زیادہ اور غلط طریقے سے استعمال موجبِ فساد ہوتا ہے۔ یہی معاملہ مغرب میں جنس (Sex) کے سلسلے میں ہوا ہے۔ جنسی آوارگی، اباحیت اور انارکی کا نتیجہ وہاں مردوں میں تولیدی صلاحیت سے محرومی اور عورتوں میں بانجھ پن کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر ان مسائل کا جو حل تلاش کیا گیا اس میں انسانی قدروں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس انحراف کے نتیجے میں انسانی معاشرہ جن سماجی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہوتا ہے، ان سے مکمل صرفِ نظر کر لیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ مصنوعی تلقیح اور اسپرم بینک کے تصورات خالص مغربی کلچر کی پیداوار ہیں۔ یہ جدید سائنسی طریقے بہ ظاہر بعض مسائل کو حل کرنے کے لیے ایجاد کیے گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں، جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔

نظامِ خاندان پر کاری ضرب

اسپرم بینک کے رواج نے خاندان کے استحکام کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ نسلِ انسانی کے تسلسل کے لیے فطرت نے زوجین کو ایک دوسرے کا محتاج اور ضرورت مند بنایا تھا۔ شوہر کا یہ احساس کہ بیوی کی کوکھ میں اس کا بچہ پل رہا ہے، اسے بیوی کی مسلسل خبر گیری اور نگہ داشت رکھنے، اس کی تمام ضرورتیں پوری کرنے اور اس کی سرپرستی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور بیوی کا یہ احساس کہ قدرت کا یہ انمول تحفہ اسے شوہر کے ذریعہ ملا ہے، اس کے دل میں شوہر کی قدر و منزلت اور محبت پیدا کرتا تھا۔ اسپرم بینک کے ذریعے اجنبی مرد کے نطفے سے مصنوعی بار آوری کے عمل نے دونوں کو ان احساسات سے عاری کر دیا ہے اور ان کا باہم جذباتی تعلق ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ دونوں بسا اوقات مالی اور مادی منفعتوں کے حصول کے لیے ایک ساتھ رہتے ہیں، ورنہ ان کے درمیان محبت و مودت اور انسیت کا تعلق نہیں رہتا۔

مغرب میں ہم جنسیت (Homosexuality) کے فروغ اور آزادیٔ نسواں

کے نتیجے میں صورت حال میں مزید بگاڑ آ گیا ہے۔ عورت کے عورت کی جانب جنسی میلان کو فطری قرار دے کر ان کے درمیان باہم شادی کو قانونی جواز فراہم کر دیا گیا ہے۔ ایسی عورتوں کی بھی خاصی تعداد ہوگئی ہے جو روایتی نکاح کو مردوں کی بالادستی قرار دے کر اس سے انکاری ہیں۔ چنانچہ وہ تنہا ہی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ پھر ان کی ممتا جاگتی ہے تو وہ اسپرم بینکوں سے رجوع کر کے اور وہاں سے اپنی پسند کے اسپرم حاصل کر کے مصنوعی تلقیح کروا لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ملکوں میں خاندانی نظام چرمرا کر رہ گیا ہے۔

نسب کی پامالی

نظامِ خاندان کے تحت اور شوہر کے نطفے سے تولید کی صورت میں افرادِ خاندان کے درمیان گہرا اور قریبی تعلق قائم ہوتا ہے۔ رشتوں کی پاس داری کی جاتی ہے۔ ان کے درمیان محبت و مودت استوار ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے اور ان کی ادائیگی کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی بنا پر انسانوں میں اپنے نسب کی حفاظت کی فطری خواہش پائی جاتی ہے۔ باپ اپنے بیٹوں کو عزیز رکھتا ہے اور بیٹے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کا باپ کون ہے؟ اسپرم بینک کے رواج نے تصورِ نسب کو قصۂ پارینہ بنا دیا ہے۔ یہ بینک اسپرم کے عطیہ دہندگان کے ذاتی اوصاف و خصوصیات کا تو ریکارڈ رکھتے ہیں، لیکن ان کی شناخت کو عموماً ظاہر نہیں کرتے۔ اگر چہ بعض ملکوں میں ایسے قوانین بنائے گئے ہیں کہ عطیہ دہندگان کے مکمل احوال و کوائف اور شخصی معلومات کا بھی ڈاٹا تیار کیا جائے، اس لیے کہ پیدا ہونے والے بچے کا یہ بنیادی حق سمجھا جاتا ہے کہ اگر بالغ ہونے کے بعد وہ یہ جاننا چاہے کہ اس کا باپ کون ہے؟ تو اسے صحیح معلومات حاصل ہو سکیں۔ لیکن نہ عطیہ دہندگان اپنے نجی کوائف کو ریکارڈ کروانا چاہتے ہیں، نہ اسپرم کا عطیہ حاصل کرنے والی عورتوں کو اس سے کوئی دل چسپی ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اسپرم بینکوں میں محفوظ ذخیرہ کا غالب حصہ اسپرم کے مجہول نمونوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

انسانی تجارت کا پیش خیمہ

زمانۂ قدیم میں انسانی تجارت عام تھی۔ انسانوں کو خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ ان کی

منڈیاں قائم تھیں اور بازار لگتے تھے، جہاں ان کی بولیاں لگائی جاتی تھیں۔خواہش مند آتے اوراپنی پسند کے غلام اورلونڈیاں چھانٹ کر لے جاتے تھے۔ان سے خودکام لیتے اوراپنے اعزاءواقارب کوتحفے میں دیتے تھے۔پھرزمانہ بدلا، بیداری آئی،انسانی عظمت و رفعت کا احساس جاگا تو انسانوں کی خریدوفروخت کو قابلِ نفرت سمجھاجانے لگا،اس سلسلہ میں نئےقوانین وضع کیے گئےاور بالآخر پوری دنیامیں اس پر پابندی عائدکردی گئی۔

اسپرم بینک نے آج نئے انداز سے انسانی تجارت کا دروازہ کھول دیا ہے۔ انسانی تخلیق میں کام آنے اور واسطے بننے والی ہر چیز آج خریدی اور بیچی جاسکتی ہے۔اسی طرح اسے کرایے پر فراہم اور حاصل کیا جاسکتا ہے،چاہے وہ عورت کا بیضہ ہو یا مرد کا اسپرم، یا ان دونوں کی تلقیح اوراس کے بعدجنین کی پرورش کے لئےعورت کا رحم۔مزید برآں یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ خواہش مندجس کوالٹی کا اسپرم چاہیں،انھیں مل سکتا ہے۔کسی لمبے شخص کا، گورے کا، اعلیٰ تعلیم یافتہ کا، بزنس مین کا،سائنس داں کا،حتیٰ کہ نوبل انعام یافتہ کا۔جن خصوصیات کے حامل شخص کا بھی اسپرم مطلوب ہو،تجارتی منڈی میں وہ دست یاب ہے۔اس کی مقررہ قیمت ادا کرکے اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔اب تک یہ چیزیں الگ الگ فراہم ہیں۔بچے چاہنے والوں کے پاس جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ اسے خرید کرحسبِ ضرورت بچے پیدا کروالیتے ہیں۔لیکن وہ دن دورنہیں جب ان چیزوں کی تجارت کرنے والے خود بچے پیدا کرواکے بین الاقوامی مارکیٹ میں انھیں فروخت کے لیے پیش کرنے لگیں گے۔

اسلام کا نقطۂ نظر

اسلام نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق رہ نمائی کی ہے۔مرد اور عورت کے درمیان کیسے تعلقات ہوں؟ ان کی جنسی خواہشات کی تکمیل کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ خاندانی زندگی کیسے گزاری جائے؟ ان تمام امور سے متعلق اصولی باتیں اس نے کھول کھول کر بیان کردی ہیں۔ان کی روشنی میں مصنوعی تلقیح اوراسپرم بینک کے بارے میں اسلام کا موقف بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

کسی اجنبی مرد کے نطفے سے بار آوری زنا کے مترادف ہے

اسلام نے نسل انسانی کے تسلسل کا واحد جائز ذریعہ نکاح کو قرار دیا ہے۔اس کے نزدیک صرف نکاح کے بعد ہی مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق کو قانونی حیثیت حاصل ہوسکتی ہے۔ماورائے نکاح جنسی تعلق کو وہ زنا قرار دیتا ہے اور اسے انتہائی گھناؤنا عمل قرار دیتے ہوئے اس سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ:

وَلاَ تَقْرَبُواْ الزِّنَى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلاً (الاسرائ:۳۲)

زنا کے قریب نہ پھٹکو۔وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

ما من ذنب بعد الشرک أعظم عند اللہ من نطفة وضعها رجل فی رحم لایحلّ له۔[۴]

بارگاہ الٰہی میں شرک کے بعد اس سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں کہ آدمی اپنا نطفہ کسی ایسے رحم میں ڈالے جو اس کے لیے حلال نہ ہو۔

امام فخر الدین رازیؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ زنا میں بہت سے سماجی، تمدنی اور اخلاقی مفاسد پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے اسلام میں اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔[۵]

اسلامی تعلیمات کی رو سے جس طرح نکاح کے بغیر مرد اور عورت کا جنسی تعلق حرام ہے، اسی طرح شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے نطفے سے عورت کے بیضے کی مصنوعی تلقیح بھی حرام ہے۔اس بنا پر اسلام ضروری قرار دیتا ہے کہ جن افراد کے نطفے اور بیضے سے جنین کی تخلیق ہو لازماً وہ رشتۂ ازدواج میں بندھے ہوئے ہوں ۔ اس کے نزدیک نہ شوہر کے نطفے سے کسی اجنبی عورت کے بیضے کی بارآوری جائز ہے اور نہ بیوی کے بیضے کو کسی اجنبی مرد کے نطفے سے بارآور کیا جاسکتا ہے۔

شیخ محمود شلتوت، سابق شیخ الجامع الازہر مصر نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے:

أمّا اذا کان التلقیح بماء رجل أجنبی عن المرأة لا یربط بینهما عقد زواج، فانه یکون فی نظر الشریعة الاسلامیة ذات التنظیم الانسانی الکریم جریمة منکرة واثماً عظیماً یلتقی مع الزنا فی إطار واحد، جوهرهما واحد ونتیجتهما واحدة[۶]

اگر تلقیح اجنبی مرد کے نطفے سے ہو اور عورت اور مرد رشتۂ ازدواج سے منسلک نہ ہوں تو اسلامی شریعت، جس نے انسانی تعلقات کے لیے پاکیزہ ضابطے بنائے ہیں، اس کی نظر میں سنگین جرم اور عظیم گناہ ہے۔ یہ زنا ہی کی ایک شکل ہے۔دونوں کا جوہر ایک ہے اور دونوں کا نتیجہ بھی ایک ہے۔

عمدہ نطفے کا انتخاب۔ جاہلی طریقہ

اسپرم بینک خواہش مندوں کو یہ سہولت بھی فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کے عمدہ اسپرم کا انتخاب کرسکیں۔ اس ذوق کی تسکین کے لیے نوبل انعام یافتگان کا اسپرم بینک قائم کیا گیا تھا۔ یہ سراسر جاہلی طریقہ ہے، جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ روایت کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے ان سے بیان کیا کہ عہدِ جاہلیت میں نکاح (مرد وعورت کے درمیان جنسی تعلق) کے چار طریقے رائج تھے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا:

كان الرجل يقول لامرأته اذا طهرت من طمثها ارسلى الى فلان فاستبضعى منه، ويعتزلها زوجها ولا يمسّها أبداً حتّٰى يتبيّن حملها من ذلك الرجل الذى تستبضع منه، فاذا تبيّن حملها أصابها زوجها اذا احبّ، وانما يفعل ذلك رغبة فى نجابة الولد، فكان هذا النكاح نكاح الاستبضاع ۷۔

عورت جب حیض سے پاک ہوتی تو اس کا شوہر اس سے کہتا تھا: تم فلاں شخص کے پاس جاؤ اور اس سے جنسی تعلق قائم کرو۔ اس کے بعد وہ اپنی بیوی سے الگ تھلگ رہتا اور اسے اس وقت تک ہاتھ نہ لگا تا تھا، جب تک اس مرد سے تعلق کے نتیجہ میں اس کا حمل ظاہر نہ ہو جاتا۔ حمل ظاہر ہو جانے کے بعد وہ حسبِ خواہش اس سے جماع کرتا تھا۔ ایسا اچھی نسل سے اولاد حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ اسے 'نکاح الاستبضاع' کہا جاتا تھا۔

یہ ایک فرسودہ، بے بنیاد اور گم راہ کن تصور ہے کہ اچھی نسل، اعلیٰ تعلیم یا دیگر عمدہ خصوصیات کے حامل مرد کے اسپرم سے اگر تلقیح کروائی جائے تو انہی خصوصیات کا حامل بچہ پیدا ہوگا۔ بچے میں موروثی خصوصیات باپ اور ماں دونوں کی طرف سے منتقل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں دیگر عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ Isodora Duncan نامی خاتون نے ایک مرتبہ نوبل انعام یافتہ مشہور انگریز ادیب اور دانش ور جارج برنارڈ شا (م ۱۹۵۰ئ) کو لکھا: ''آپ کے پاس دنیا کا سب سے اعلیٰ دماغ ہے اور میرے پاس خوب صورت ترین جسم۔ ہم دونوں مل کر ایک اعلیٰ خصوصیات کا حامل بچہ پیدا کرسکتے ہیں۔'' برنارڈ شا نے اس کا یہ جواب دیا: ''عزیزِ من! اگر بچے میں

میرے جسم اور تمہارے دماغ کی وراثتی خصوصیات منتقل ہوگئیں تو کیا ہوگا ؟! ''

شوہر کے انتقال کے بعد اس کے محفوظ نطفے سے بار آوری جائز نہیں

پیچھے گزر چکا ہے کہ اگر کسی مرض یا عذر کی وجہ سے زوجین کے درمیان طبعی طور پر جنسی تعلق قائم نہ ہو سکے تو شوہر کے نطفے سے مصنوعی تلقیح کے ذریعے بیوی کو بار آور کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنا نطفہ اسپرم بینک میں جمع کرایا ہو تو کیا اس کی وفات کے بعد بیوی اسے حاصل کر کے اور اس کے ذریعہ بار آور ہو کر بچہ پیدا کر سکتی ہے؟ اسلامی شریعت کی رو سے اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ شوہر کی وفات کے بعد بیوی کا اس سے ازدواجی رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی فقہی اکیڈمیوں میں اس موضوع پر غور و خوض کیا گیا ہے اور تمام فقہاء نے بالاتفاق شوہر کی وفات کے بعد اس کے نطفے سے عورت کی تلقیح کو حرام قرار دیا ہے۔ مجمع البحوث العلمیة نے اپنے اجلاس منعقدہ عمان ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء میں فیصلہ کیا کہ:

> ''شوہر کے انتقال کے بعد اس کے نطفے سے بیوی کو بار آور کرنا شرعی طور پر حرام ہے، اس لیے کہ اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی۔ یہ فعل شرعاً حرام ہے، اس لیے کہ یہ ایک مرد کے حیوانات منویہ کو ایسی عورت کے رحم میں ڈالنے کے مثل ہے جو اس کے لیے اجنبی ہے، کیوں کہ موت نے ان کے درمیان رشتۂ ازدواج کو ختم کر دیا ہے۔'' ۸؎

ڈاکٹر ابوالفضل محسن ابراہیم نے اس موضوع پر اسلامی شریعت کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

> ''اسلامی قانون کی رو سے یہ بھی ناجائز ہوگا کہ ایک شوہر اپنا نطفہ مادۂ تولید بینک میں اس خیال سے جمع کرائے کہ اس کی موت کے بعد اسے اس کی بیوی کو حاملہ کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ کیوں کہ موت اس معنیٰ میں رشتۂ ازدواج کو کالعدم کر دیتی ہے کہ عورت عدّت پوری کرنے کے بعد کسی

دوسرے سے نکاح کرسکتی ہے۔لہٰذا شوہر کی موت کے بعد اس کے محفوظ نطفہ
سے اس کی بیوی کو حاملہ کرنا بھی ایک ناجائز فعل ہوگا۔'' ۹؎

شوہر کی زندگی میں اس کے محفوظ نطفے سے بارآوری کا حکم

اگر کسی شخص نے اپنا نطفہ اسپرم بینک میں جمع کرادیا ہو، اس کے بعد کسی حادثہ کی وجہ سے وہ جماع پر قادر نہ ہوسکے، یا کسی نوعیت کے علاج کے نتیجے میں اس کی قوتِ مردمی ختم ہوگئی ہو، تو کیا بعد میں اس کی زندگی میں اس کے نطفے سے اس کی بیوی مصنوعی تلقیح کرواسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب فقہاء کی تحریروں یا فقہی اکیڈمیوں کے فیصلوں میں صراحت سے تو نہیں ملتا، لیکن ان کے دیگر فیصلوں کی روشنی میں اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم المجمع الفقھی الاسلامی مکہ مکرمہ نے اپنے ساتویں سمینار منعقدہ ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء اور آٹھویں سمینار منعقدہ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء میں اور تنظیم اسلامی کانفرنس کی زیر نگرانی قائم بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے اپنے تیسرے اجلاس منعقدہ عمّان (اردن) ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۶ء میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ'' شوہر کے نطفے سے بیوی کی مصنوعی تلقیح، خواہ بہ راہ راست کی جائے یا بیرونی طور پر پہلے ان کے نطفے اور بیضے کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کرلیا جائے، پھر اس بارآور بیضہ کو عورت کے رحم میں منتقل کیا جائے، دونوں صورتیں جائز ہیں۔'' ۱۰؎ اور یہ معلوم ہے کہ مصنوعی تلقیح تازہ اسپرم کے ذریعے بھی ممکن ہے اور اسپرم بینک میں محفوظ منجمد اسپرم کے ذریعے بھی۔ اس بنا پر جس طرح شوہر کے تازہ اسپرم سے بیوی کی مصنوعی تلقیح جائز ہے، اسی طرح اسپرم بینک میں محفوظ اس کے نطفے سے بھی کی جاسکتی ہے۔

اسپرم بینک کا قیام اور اسپرم کی خرید فروخت

گزشتہ تفصیل سے واضح ہوا کہ اسپرم بینک سے استفادہ کی بیش تر صورتیں اسلامی شریعت کی رو سے حرام ہیں۔ اگرچہ مغربی ممالک میں اسے بہت زیادہ رواج مل گیا ہے اور مغربی کلچر کے زیر اثر دنیا کے بیش تر ممالک میں اسپرم بینک قائم ہوگئے ہیں،

لیکن اس کے متنوع مفاسد کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے نہ اسپرم بینک کا قیام جائز ہے نہ وہاں سے اسپرم کی خرید وفروخت کی اجازت ہے۔ڈاکٹر عبداللہ بن محمد الطیار، استاذ الدراسات العلیا، کلیۃ الشریعۃ والدراسات العلیا، جامعۃ القصیم، سعودی عرب نے اپنے ایک مقالے میں اس موضوع سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بانجھ پن پوری دنیا اور خاص کر مغربی دنیا کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔اس لیے اس کے علاج کا جو طریقہ بھی ہو، اسے طبی حلقوں اور عوام میں قبولِ عام حاصل ہوتا ہے۔ اولاد کے حصول کے لیے بہت سے طریقے رائج ہو گئے ہیں، لیکن وہ شرعی طور پر جائز نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک ناجائز طریقہ مرد کے نطفے کی خرید وفروخت اور مصنوعی تلقیح میں اس کا استعمال ہے۔ مغرب میں اس کے لیے مخصوص بینک قائم ہو گئے ہیں، جہاں نطفے جمع کیے جاتے ہیں اور لوگ اپنی پسند کے نطفے وہاں سے خریدتے ہیں۔ یہ چیز اسلام میں مطلق حرام ہے۔ اس میں بہت سے مفاسد پائے جاتے ہیں۔اس طریقے سے ایسے بچے پیدا ہوں گے جن کا صحیح نسب غیر معروف ہوگا۔ مصنوعی تلقیح کا جواز صرف بانجھ پن اور عدمِ تولید کی چند مخصوص حالتوں میں ہی ہوسکتا ہے، جب کہ اس میں مادّی، معاشرتی، اخلاقی اور قانونی اعتبار سے بہت سے مفاسد ہیں۔ مصنوعی تلقیح کے یہ جدید طریقے صحیح شرعی نکاح کو کالعدم کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔ان سے فطرت کی خلاف ورزی ہورہی ہے، اخلاقی اور اجتماعی مسائل پیدا ہورہے ہیں اور دنیا میں ایسی نسل ظاہر ہورہی ہے جس کا نسب معلوم نہیں اور ایسے خاندان وجود میں آرہے ہین جن کے درمیان رشتۂ ازدواج نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نطفہ کی خرید وفروخت حرام ہے اور مسلمانوں کے لیے اسپرم بینک قائم کرنا جائز نہیں۔ یہ عمل شرعاً حرام ہے، اس لیے کہ اس میں بہت سے غیر شرعی کام لازم آتے ہیں، جن سے فطرتِ سلیمہ ابا کرتی ہے۔'' [۱۱]

اسپرم بینک خدائی ہدایات اور الٰہی شریعت سے بے پروا مغربی تہذیب کا شاخسانہ ہے۔ اس سے اجتناب کے ساتھ اس کے اخلاقی، سماجی اور روحانی مفاسد کو بھی نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: محمد رضی الاسلام ندوی، تخلیق انسانی کے مراحل اور قرآن کا سائنسی اعجاز، اسلامک بک فاونڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۴ئ ص ۲۴۔۲۵

۲۔ ملاحظہ کیجیے: محمد رضی الاسلام ندوی، مقالات طب، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۶ء جلد اول، ص ۷۔۸، مقالہ: مصنوعی طریق ہائے تولید اور اسلام

۳۔ حوالہ سابق، مزید ملاحظہ کیجیے: منور احمد انیس، مقالہ: تولیدی حیاتیات، اردو ترجمہ: اسرار احمد خاں، سہ اشاعتی مجلہ آیات علی گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری۔ مارچ ۱۹۹۰ئ، ابو الفضل محسن ابراہیم، جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام، اردو ترجمہ: اسرار احمد خاں، مرکز الدراسات الاسلامیۃ علی گڑھ، ۱۹۹۵ء

۴۔ ابن ابی الدنیا، کتاب الورع، حدیث نمبر ۱۳۷۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، تفسیر الاسرائ: ۳۲۔ یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے، لیکن اس کا مضمون قرآنی آیات اور دیگر احادیث سے ثابت ہے۔

۵۔ فخر الدین رازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، تفسیر آیت الاسرائ: ۳۲

۶۔ الشیخ محمود شلتوت، الفتاوی، دار الشروق القاہرۃ، ۲۰۰۴ئ ص ۲۸۱

۷۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من قال لانکاح الا بولی: ۵۱۲۷

۸۔ ملاحظہ کیجیے: شادیۃ الصادق الحسن، حکم الاسلام فی التلقیح الصناعی، مجلۃ العلوم و البحوث الاسلامیۃ، السودان، العدد ۲، فبرائر ۲۰۱۱، ص ۹ بہ حوالہ احمد محمد لطفی، التلقیح الصناعی بین اقوال الاطباء وآراء الفقہائ، طبع ۲۰۰۶ئ، ص ۱۰۴۔ محمد احمد طہ، الانجاب بین التحریم و المشروعیۃ، توزیع: مسأۃ المعارف بالاسکندریۃ، ۲۰۰۳ئ ص ۱۲۰

۹۔ جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام، ص ۹۳

۱۰۔ ملاحظہ کیجیے: رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۲، ص ۱۹۴، ۲۰۵۔۲۰۶، جدید فقہی مسائل اور ان کا مجوزہ حل (بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے فقہی اجلاسوں کی قراردادیں اور سفارشات)، ماڈرن اسلامک فقہ اکیڈمی کراچی، ۲۰۰۶ئ ص ۵۱

۱۱۔ د۔ عبد اللہ بن محمد الطیار، الضوابط الشرعیۃ فی المعاوضۃ علی الحقوق و الالتزامات، www.m-islam.net، بحث: بیع المنی

☆☆☆

تحقیق وتنقید

سابقہ شریعتوں سے استدلال اور امام بخاریؒ کا موقف

جناب عبدالغفار

بنی نوع انسان ابتدائے آفرینش سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے محتاج رہے ہیں۔ ان کی کام یابی وکام رانی اس کے بغیر ناممکن ہے۔جب بھی انھوں نے اس سے منہ موڑا وہ ناکام رہے۔(البقرۃ:۳۸-۳۹) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ اسی ہدایت کا نام اسلام ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ترین دین ہے۔(آل عمران:۱۹) حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاء ورسل اسی دین کی تعلیم وتبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے۔حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ نے اپنی ذریت کو اسی کی وصیت کی تھی۔(البقرۃ:۱۳۲)

دین اور شریعت معمولی فرق کے ساتھ علمائے اصولیین کے نزدیک مترادف الفاظ ہیں۔اس بحث میں 'شرع من قبلنا' (گذشتہ اقوام کی شریعتوں) کی حجّیت پر علماء اصولیین کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے خصوصی طور پر سید المحدثین امام بخاریؒ کا موقف صحیح بخاری کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، تاکہ اس کی بنیاد پر مکالمہ بین المذاہب کی راہیں ہموار ہو سکیں۔

شریعت کا مفہوم

اہل لغت کے ہاں 'الشریعة' کا معنیٰ وہ جگہ ہے جہاں سے لوگ پانی لیتے اور پیتے ہیں۔اسی معنی میں شرع اور شرعة کو بھی استعمال کیا جاتا ہے، یعنی وہ جگہ جہاں سے پانی جاری ہو اور ختم نہ ہونے والا ہو۔[۱] اسی سے واضح اور کھلے راستے کو شریعت کہا جانے لگا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ثُمَّ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَةٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡهَا وَ لَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (الجاثیۃ:۱۸)

پھر ہم نے تم کو دین کے کھلے راستے پر (قائم) کر دیا۔لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے ۔

سابقہ شریعتوں سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے گزشتہ امتوں کے لیے بھیجے تھے اوران کے نبیوں اور رسولوں پر نازل کیے تھے،تا کہ وہ انہیں اپنی امتوں تک پہنچادیں۔

سابقہ شریعتوں کی اقسام

سابقہ شریعتوں کی درج ذیل چار اقسام بیان کی گئی ہیں :

۱۔جن کا ذکر شریعت اسلامیہ میں نہیں ہے

اس سے مراد وہ احکام ہیں جو شریعت اسلامی میں مذکور نہیں ہیں ،یعنی قرآن مجید اور سنت رسول میں انہیں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ایسے احکام کے بارے میں علمائے اصول کا اتفاق ہے کہ وہ ہمارے لیے حجت نہیں ہیں۔

۲۔شریعت اسلامیہ میں مذکور احکام

وہ احکام جنہیں شریعت اسلامی نے بیان کیا ہے اور قرآن مجید یا سنت رسول میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ وہ احکام ہم پر بھی اسی طرح فرض ہیں جس طرح سابقہ امتوں پر فرض تھے۔ یہ قسم بلا نزاع شرعی حجت ہے۔

مثلاً قرآن مجید میں سابقہ امتوں پر روزہ کی فرضیت کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی امت مسلمہ پر بھی اس کو فرض قرار دیا گیا ہے۔فرمان الٰہی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ (البقرۃ:۱۸۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تا کہ تم میں تقوی کی صفت پیدا ہو۔

اسی طرح قربانی شریعتِ ابراہیمی کی نشانی ہے جسے شریعت اسلامی میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔حضرت زید بن ارقمؓ سے مروی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! یہ قربانی کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

سنة أبیکم إبراهیم۔ ۲؎

یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے۔

۳۔شریعت اسلامیہ سے منسوخ احکام

اس سے مراد وہ احکام ہیں جن کا ذکر قرآن مجید یا سنت نبویؐ میں کیا گیا ہے، لیکن ان کا منسوخ ہونا ان کی کسی نص سے ثابت ہے۔شریعت اسلامیہ، شرائع سابقہ کے جن احکام کی ناسخ ہے وہ بالاتفاق ہمارے لیے شرعی حجت نہیں ہیں۔مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (الانعام:۱۴۶)

اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانوروں کو حرام کر دیا تھا اور گائے اور بکری میں سے ان دونوں کی چربیاں ہم نے ان پر حرام کی دی تھیں، مگر ہاں ان دونوں کی وہ چربی جو ان کی پیٹھ پر یا ان کی آنتوں میں لگی ہوئی ہو یا ان کی ہڈی سے ملی ہوئی ہو وہ حرام نہیں تھی۔ ہم نے ان کو یہ سزا ان کی شرارت اور سرکشی کی وجہ سے دی تھی اور یقیناً ہم سچے ہیں۔

آیت بالا کے مطابق یہود کے لیے جو چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں، قرآن و سنت کی دیگر نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امت مسلمہ کے لیے حرام نہیں ہیں۔

سابقہ امتوں پر مالِ غنیمت حرام تھا۔وہ اسے ایک جگہ پر جمع کر کے رکھ دیتیں اور آسمان سے آگ آکر اسے بھسم کر دیتی تھی، جب کہ امت مسلمہ کے لیے مال غنیمت کو حلال قرار دے دیا گیا۔شریعت اسلامی نے مال غنیمت کی حرمت کے حکم کو منسوخ کر دیا۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

و أحلت لی الغنائم ولم تحلّ لأحد من قبلی۔ ۳؎

اور میرے لیے غنیمت کے اموال حلال کر دیے گئے جو مجھ سے پہلے کسی نبی کے لیے حلال نہ کیے گئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں گناہوں سے توبہ کا طریقہ اپنی جانوں کو قتل کرنا تھا۔قرآن کریم میں ہے:

فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ (البقرۃ:۵۴)

لہٰذا تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو۔اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ پر احسان فرمایا کہ اگر اس سے تعلق رکھنے والے صدق دل سے اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگ لیں تو ان کی بخشش ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا (التحریم: ۸)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو، خالص توبہ۔

۴۔ شریعتِ اسلامیہ میں مذکور ایسے احکام جن کا نہ اقرار ہے نہ انکار:

شرائع سابقہ کے وہ احکام جن کا ذکر قرآن مجید یا سنت میں ہوا ہے، لیکن دونوں نے نہ ان کا اقرار کیا ہے اور نہ انکار۔ یعنی شریعت اسلامیہ میں ان احکام کی فرضیت یا منسوخی کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً تورات کا ایک حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ بیان فرمایا ہے:

وَ کَتَبْنَا عَلَیْھِمْ فِیْھَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِہٖ فَھُوَ کَفَّارَۃٌ لَّہٗ (المائدۃ: ۴۵)	تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا صدقہ کرے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔

شرائع سابقہ کے احکام کی اس قسم کے شرعی حجت ہونے یا نہ ہونے کے مسئلہ پر علمائے اصول کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ احکام حجت تسلیم کیے جائیں گے، جب کہ بعض کے ہاں ایسے احکام، شریعت اسلامیہ کا حصہ نہیں، لہٰذا وہ حجت نہیں ہیں۔ ذیل میں دونوں گروہوں کے دلائل پیش کیے جارہے ہیں۔

قائلین (حجت تسلیم کرنے والے) اور ان کے دلائل

علمائے اصول کا ایک گروہ شرائع سابقہ کے احکام کو شرعی دلیل اور حجت تسلیم کرتا ہے۔ ان علماء کے نزدیک سابقہ شریعتوں کے جو احکام ہماری شریعت میں بیان کیے گئے ہیں اور وہ شریعت اسلامیہ کی کسی نص سے منسوخ نہیں ہوئے ہیں، وہ اب سابقہ شریعتوں کے احکام نہیں رہے، بلکہ ہمارے نبی ﷺ کی شریعت کا حصہ ہیں، لہٰذا وہ

ہمارے لیے حجت ہیں۔ البتہ شرائع سابقہ کے احکام معلوم کرنے کے لیے یہود ونصاری کی کتب کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں۔ ان کی روایات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ انہوں نے اپنی کتب میں تحریفات کر دی ہیں اور ان کی روایات میں تواتر بھی مفقود ہے۔ لہٰذا ان کے بارے میں وہی کچھ معتبر اور قابل اعتماد ہے جو وحی متلو (قرآن مجید) یا وحی غیر متلو (سنت) کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔

شرائع سابقہ کو حجت تسلیم کرنے والوں میں جمہور اصحاب امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ)، امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ)، بعض اصحاب شافعیہ اور جمہور حنابلہ شامل ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) سے بھی ایک روایت ہے کہ شرائع سابقہ کے جن احکام کا نسخ ثابت نہیں ہے ان کا اعتبار کیا جائے گا۔

یہ حضرات اپنے موقف کی تائید میں جو دلائل پیش کرتے ہیں ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام:۹۰)

وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے۔ (اے نبی) انہی کے راستے پر آپ چلیں۔

اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کے انبیاء کرامؑ کو ہدایت یافتہ کہا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے راستے پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ لہذا ان کی شریعت آپؐ کی بھی شریعت ہے۔

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (النحل: ۱۲۳)

پھر ہم نے آپؐ کی طرف یہ وحی بھیجی کہ یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے پر چلیں۔

اس آیت کریمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابراہیمؑ کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

احادیث نبوی سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اپنے اصحاب کے ہم راہ غزوۂ خیبر سے لوٹے تو رات کو ایک جگہ قیام فرمایا۔ تھکن کی وجہ سے سب دیر تک سوتے رہ گئے، یہاں تک کہ ان کی نمازِ فجر قضا ہو گئی۔ بیدار ہونے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

اپنے صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھائی، پھر فرمایا:

من نسی صلوۃ الفجر فلیصلّھا اذ ذکرھا، فان اللہ قال وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ۔ ۵؎

جو شخص نماز فجر بھول جائے تو جب اس کو یاد آئے اس وقت اسے پڑھ لے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

قرآن مجید کی جس آیت (طٰہٰ: ۱۴) کا حوالہ حدیث بالا میں موجود ہے، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شرائع سابقہ کے احکام ہمارے لیے حجت ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے رات کو نوافل پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے کا معمول بنالیا تھا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپؐ نے ان سے فرمایا:

فصم صوم داؤد علیہ السلام، کان یصوم یوماً ویفطر یوما۔ ۶؎

حضرت داؤدؑ کا سا روزہ رکھو۔ وہ ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے۔ آپؐ کو معلوم ہوا کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو دریا میں غرق کر دیا تھا اور حضرت موسیٰؑ کو نجات دی تھی، اس کے شکرانے کے طور پر یہود عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

أنا أولیٰ بموسی منھم۔ ۷؎

میں ان کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قریب ہوں۔

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:

”زیادہ راجح اور حق کے قریب قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملتِ ابراہیمی کی شریعت کے زیادہ تابع تھے۔ آپ ملتِ ابراہمی کو تلاش کرتے اور جو بات اس سے ثابت ہوتی اس پر عمل پیرا ہوتے۔“ ۸؎

منکرین اور ان کے دلائل

جو علماء شرائع سابقہ کی عدم حجیت کے قائل ہیں ان میں امام ابن حزم، امام

غزالی، امام رازی، ابن سمعانی،خوارزمی، ابو اسحاق شیرازی، نووی، قاضی اسماعیل بن اسحاق مالکی، ابن العربی رحمہم اللہ اور اشاعرہ ومعتزلہ شامل ہیں۔ شافعیہ کے نزدیک بھی یہی مؤقف راجح ہے۔ ۹؎

یہ حضرات اپنے موقف کے حق میں درج ذیل دلائل بیان کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدۃ:۴۸)

ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کردی ہے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ہر امت کے لیے الگ شریعت ہے، لہٰذا ایک امت دوسری امت کی شریعت کی مکلف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں مختلف امتیں پیدا کی ہیں، جو اپنی اپنی شریعتوں پر عمل کرنے کی مکلف تھیں۔ تمام زمانوں کے انسان ایک امت نہیں، بلکہ مختلف امتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہے کہ مختلف امتیں ہوں اور ان کی الگ الگ شریعتیں ہوں۔ اس تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ (المائدۃ:۴۸)

اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا، لیکن یہ اس نے اس لیے نہیں کیا کہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب گورنر بنا کر یمن بھیجنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے گا تو اس کا فیصلہ کس طرح کروگے؟ انھوں نے عرض کیا: اللہ کی کتاب کے موافق فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے موافق فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: اگر سنت میں بھی نہ پاؤ؟ انھوں نے عرض کیا: پھر میں اپنی عقل، غور وفکر اور رائے سے فیصلہ کروں گا اور کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا سینہ تھپکا اور فرمایا:

الحمد لله الذی وفّق رسول رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لما یرضی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ۱۰؎

ہر طرح کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد کو اس چیز کی توفیق بخشی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔

اگر شرائع سابقہ کے احکام حجت ہوتے تو حضرت معاذؓ اس موقع پر ان کا ذکر ضرور کرتے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں تورات کا کچھ حصہ دیکھا تو ناراضی کا اظہار کیا۔ اس موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

لو کان موسی حیاً بین أظھر کم ما حلّ له الاّأن یتبعنی۔[۱۱]	اگر موسیٰؑ بھی آج تمہارے درمیان زندہ ہوتے تو ان کے لیے میرا اتباع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔

شرائع سابقہ سے شریعت محمدیؐ کا ربط

گزشتہ پیغمبروں کی شریعتیں ان کی امتوں کے لیے خاص تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کسی زمان و مکان اور قوم کے لیے خاص نہیں، بلکہ قیامت تک تمام انسانوں کے لیے ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے سورۃ الشوریٰ آیت نمبر ۱۳ شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوۡحًا۔۔۔الآیۃ کی تفسیر میں لکھا ہے:

> ’’شرع کے معنی راستہ بنانے کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ عربی زبان میں اسی اصطلاحی معنی کے لحاظ سے ’تشریع‘ کا لفظ ’قانون سازی‘ (Legislation) کا ’شرع‘ اور ’شریعت‘ کا لفظ ’قانون‘ (Law) اور ’شارع‘ کا لفظ ’واضع قانون‘ (Law giver) کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تشریعِ خداوندی دراصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے ان اصولی حقائق کا جو اوپر آیت نمبر ۱، ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں کہ اللہ ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے اور وہی انسان کا حقیقی ولی ہے۔۔۔ اس لیے لامحالہ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ انسان کے لیے قانون وضابطہ بنائے اور اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون وضابطہ دے۔۔۔ دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع وہی ہے جس کی ہدایت نوح اور ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھی اور اسی کی ہدایت اب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی ہے۔ اس ارشاد سے کئی باتیں نکلتی ہیں۔۔۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تشریع کو براہ راست ہر انسان کے پاس نہیں بھیجا ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً جب اس نے مناسب سمجھا ہے،

ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کر کے یہ تشریع اس کے حوالے کی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تشریع ابتدا سے یکساں رہی ہے۔۔۔۔ تیسرے یہ کہ اللہ کی سیادت و حاکمیت ماننے کے ساتھ ان لوگوں کی رسالت کو ماننا، جن کے ذریعہ سے یہ تشریع بھیجی گئی ہے اور اس وحی کو تسلیم کرنا، جس میں یہ تشریع بیان کی گئی ہے، اس دین کا لازمی جزء ہے۔'' ۱۲؎

امام بخاریؒ کا موقف و منہج

امام بخاریؒ کے انداز اور رجحان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مذہبِ جمہور راجح ہے۔ انھوں نے اپنی صحیح کے بہت سے ابواب میں امم سابقہ کی شرائع سے استدلال کیا ہے، چاہے ان کا تذکرہ کتاب اللہ میں آیا ہو یا حدیث رسول میں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سے تراجمِ ابواب منعقد کیے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''امام بخاریؒ نے متعدد مقامات پر ماقبل شرائع سے استدل کیا ہے''۔ ۱۳؎

چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

پہلی مثال: امام بخاریؒ نے ایک جگہ یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے:

باب من اغتسل عریاناً وحدہ فی الخلوۃ ومن تستّر فالتستّر أفضل۔

یہ بیان کہ ایک شخص نے تنہائی میں عریاں ہو کر غسل کیا اور دوسرے نے کپڑا باندھ کر غسل کیا تو کپڑا باندھ کر غسل کرنا افضل ہے۔

اس کے تحت انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث روایت کی ہے:

کانت بنو اسرائیل یغتسلون عراۃً ینظُر بعضھم الی بعضٍ وکان موسیٰ یغتسل وحدہ، فقالوا واللہ ما یمنع موسیٰ ان یغتسل معنا الاّ انہ آدَرُ، فذھب مرۃ یغتسل، فوضع ثوبہ علی حجرٍ، ففرّ الحجر بثوبہ، فخرج موسیٰ فی إثرہٖ یقول ثوبی یاحجر،

بنو اسرائیل ننگے نہایا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے، جب کہ موسیٰ علیہ السلام اکیلے نہاتے تھے۔ بنی اسرائیل کا خیال تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس عمل کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ہائیڈروسیل کی بیماری ہے۔ ایک بار آپؑ نہانے لگے تو پتھر آپ کے کپڑے لے بھاگا۔ موسیٰؑ السلام اس کے پیچھے دوڑے اور اسے کہتے رہے:

حتی نظرت بنو اسرائیل الی موسیٰ، فقالوا واللہ ما بموسی من بأس وأخذثوبه، فطفق بالحجر ضرباً۔ ۱۴؎

او پتھر میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ بنو اسرائیل نے دیکھ لیا کہ ان کا خیال غلط تھا۔ انہوں نے اپنے کپڑے لیے اور پتھر کو اپنے عصا سے مارا۔

اسی باب کے تحت دوسری حدیث بھی حضرت ابوہریرۃ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بینما أیوب یغتسل عریاناً فخرّ علیه جراد من ذهب، فجعل أیوب یحتثی فی ثوبه، فناداہ ربه یا ایوب الم اکن اغنیتک عما تری؟قال بلی وعزّتک، ولکن لاغنی بی عن برکتک ۱۵؎

حضرت ایوبؑ برہنہ غسل فرمارہے تھے کہ اچانک ان پر سونے کی ٹڈیاں گرنے لگیں۔ حضرت ایوبؑ انہیں اپنے کپڑے میں سمیٹنے لگے۔ ان کے رب نے پکارا: اے ایوب! کیا ہم نے تمہیں اس سے بے نیاز نہیں کردیا ہے؟ انھوں نے عرض کی: کیوں نہیں، مگر میں تیری برکات سے بے نیاز نہیں ہوں۔

ان دونوں احادیث میں دو انبیاء کے برہنہ ہوکر غسل کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے شرائع سابقہ سے عریاں نہانے کا جواز ملتا ہے۔ اس کے ذریعے امام بخاریؒ نے ان لوگوں کا رد کیا ہے جنھوں نے تنہائی میں عریاں ہوکر نہانے کو ناجائز کہا ہے، مگر ستر ڈھانپ کر نہانا افضل قرار دیا ہے۔ دونوں احادیث میں امام بخاریؒ کے شیوخ مختلف ہیں۔ دونوں جگہ انھوں نے روایت کو بیان کرکے استنباطات کیے ہیں جو ان کی اجتہادی بصیرت کا واضح ثبوت ہیں۔

دوسری مثال: امام بخاری نے حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی یہ روایت بیان کی ہے:

أرسل ملک الموت الی موسی فلما جاءہ صکّه، فرجع الی ربه فقال: أرسلتنی الی عبدٍ لا یرید الموت فردّ اللہ علیه عینه و قال ارجع الیه، فقل له یضع یدہ علی متن ثورٍ، فله بکل ما غطّت یدہ بکل شعرةٍ سنة، قال أی

ملک الموت کو آدمی کی شکل میں حضرت موسیٰؑ کے پاس بھیجا گیا۔ وہ جب ان کے پاس گیا تو موسیٰؑ نے نہ پہچان کر اسے ایک زور کا طمانچہ ماردیا۔ وہ واپس اپنے رب کے حضور پہنچا اور عرض کیا: اے اللہ، تو نے مجھے ایسے بندے کی طرف بھیجا جو مرنا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ پہلے کی طرح کردی اور کہا: دوبارہ جا اور ان سے کہہ کہ آپ اپنا ہاتھ ایک بیل

رب، ثم ماذا؟ قال ثم الموت، قال فالآن، فسأل اللّٰہ تعالیٰ أن یدنیه من الأرض المقدسة رمیةً بحجرٍ۔

کی پیٹھ پر رکھیے۔ جتنے بال آپ کے ہاتھ تلے آجائیں ان میں سے ہر بال کے بدلے آپ کو ایک سال کی زندگی دی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا: اے اللہ! پھر کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کے بعد موت آئے گی۔ موسیٰؑ نے فرمایا: پھر ابھی کیوں نہ آجائے۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ انہیں ارض مقدس سے اتنا قریب کر دے کہ کوئی شخص پتھر پھینکے تو وہ ارض مقدس تک پہنچ جائے۔

یہ بیان کر کے حضرت ابوہریرہؓ نے کہا: اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "اگر میں وہاں ہوتا تو تمھیں ان کی قبر دکھاتا، جو راستے کے کنارے لال ٹیلے کے پاس ہے"۔۱۶؎

اس حدیث پر امام بخاری نے یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: "باب من أحبّ الدفن فی الأرض المقدسة أو نحوها" (اس چیز کا بیان کہ کوئی شخص ارض مقدس یا ویسی ہی کسی جگہ دفن ہونے کا آرزومند ہو۔) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک بیت المقدس یا دیگر متبرک مقامات پر، دفن ہونے کی آرزو کرنا درست ہے۔

تیسری مثال: امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان سے فرمایا:

أحبّ الصلاة الی اللہ صلاة داؤد وأحب الصیام الی اللہ صیام داؤد کان ینام نصف اللیل ویقوم ثلثه وینام سدسه ویصوم یوماً ویفطر یوماً۔۱۷؎

اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب نماز داؤدؑ کی نماز ہے۔ اسی طرح اس کو سب سے محبوب روزہ داؤدؑ کا روزہ ہے۔ وہ نصف شب سوتے تھے، پھر ایک تہائی شب عبادت کرتے تھے، پھر شب کا چھٹا حصہ سوتے تھے۔ اسی طرح وہ ایک دن وقفہ کر کے روزہ رکھا کرتے تھے۔

اسی طرح امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ یہود عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بڑا مبارک دن ہے۔ اس دن اللہ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن (فرعون) سے نجات دی تھی۔ اس کے شکرانے کے طور پر

حضرت موسیٰؑ نے روزہ رکھا تھا۔اسی لیے ہم بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے بھی اس دن کا روزہ رکھااور دوسروں کوبھی روزہ رکھنے کاحکم دیا۔آپؐ نے فرمایا:

فانا أحقّ بموسی منکم ۱۸؎

میں تم سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طریقے پر عمل کا مستحق ہوں۔

امام بخاریؒ نے ایک جگہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

کان رسول اللہ ﷺ یحبّ موافقة أهل الکتاب فیما لم یؤمر فیه بشیٔ۔ ۱۹؎

رسول اللہ ﷺ ان باتوں میں، جن میں آپؐ کو کوئی حکم نہیں دیا جاتا تھا، اہل کتاب کی موافقت کو پسند کرتے تھے۔

امام بخاریؒ کی روایت کردہ ان احادیث اور حضرت ابن عباسؓ کے اثر سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سابقہ شریعتوں کی وہ باتیں ہمارے لیے حجت ہیں۔

چوتھی مثال: امام بخاریؒ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کا واقعہ کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ قرآن کریم اور حدیث نبوی دونوں میں مذکور ہے۔اس میں ہے کہ حضرت موسیٰ اور خضر ایک بستی میں پہنچے، جہاں ایک دیوار گرنے کے قریب تھی۔ حضرت خضر نے اس کی بلا اجرت مرمت کردی۔ اس پر حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ آپ چاہتے تو اس کی اجرت لے سکتے تھے۔امام بخاریؒ نے کتاب الاجارۃ میں مروی حدیث پر یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے:

باب اذا استاجر أجیراً علی أن یقیم حائطا یرید ان ینقضّ جاز۔

اس چیز کا بیان کہ کوئی شخص اس لیے مزدور حاصل کرے کہ وہ دیوار بنائے جو گرنے کے قریب ہو تو یہ جائز ہے۔

امام بخاریؒ کا یہ استنباط اس بات کی دلیل ہے کہ سابقہ شریعت ہمارے لیے حجت ہے۔

پانچویں مثال: امام بخاریؒ نے نماز جمعہ کی فرضیت ثابت کرتے ہوئے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نحن الآخرون السابقون یوم القیامۃ بید انّھم أوتو الکتاب من قبلنا، ثم ھذا یومھم الذی فُرض علیھم فاختلفوا فیہ، فھدانا اللّٰہ لہ۔۲۰

ہم دنیا میں تمام امتوں کے بعد ہونے کے باوجود قیامت میں سب سے آگے رہیں گے۔ اہل کتاب کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی، پھر یہ دن (جمعہ) ان پر فرض ہوا، لیکن انہوں نے اس میں اختلاف کیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف ہماری رہ نمائی کی۔

اس سے امام بخاریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اہل کتاب پر جمعہ فرض تھا، لیکن انھوں نے اسے فراموش کر دیا۔ اس سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ ہم پر بھی جمعہ فرض ہے۔

نتیجہ بحث

شرائع سابقہ سے استدلال اور ان کو قابل اتباع ماننے کا مسئلہ کافی اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو شریعت سے نوازا تھا اور اس کی امت کو اس پر عمل کا پابند کیا تھا۔ اسی طرح آخری شریعت کا نزول خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوا۔ اقامتِ دین اور اقامتِ شریعت ایک ہی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دین تمام امتوں کے لیے ایک ہی تھا، البتہ ان کی شریعتوں میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے، مگر اس کے اوقات، اجزاء اور رکعات میں فرق تھا۔ اسی پر ہم دیگر احکامِ شریعت کو قیاس کر سکتے ہیں۔ شریعت محمدی دوسری شرائع کی ترقی یافتہ اور جامع ترین شکل ہے۔ خصوصاً ملتِ ابراہیمی کی جامع ترین صورت ہے۔ اسی بنا پر جمہور علماء سابقہ شریعتوں کو ان معاملات میں حجت سمجھتے ہیں جن میں نصوص سے ان کا نسخ ثابت نہ ہو۔ امام بخاریؒ کی روایت کردہ احادیث اور استدلالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مذہبِ جمہور راجح ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی صحیح کے بہت سے ابواب میں سابقہ شرائع سے استدلال کیا ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ الصحاح: ۳/۱۲۳۶؛ تہذیب اللغۃ: ۱/۴۲۵؛ کتاب العین: ۲/۳۲۳؛ اساس البلاغۃ، ص ۲۳۳

۲۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاضاحی، باب ثواب الأضحیۃ، ۳۱۲۷

۳۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، باب التیمّم، ۳۳۵

۴۔ الاحکام فی اصول الاحکام: ۴/۱۹۰؛ اصول البزدوی، ص ۲۳۲؛ ارشاد الفحول: ۲/۲۵۷؛ اصول مذہب الامام احمد بن حنبلؒ: ص ۴۸۵ و مابعد، المستصفی: ۲/۱۸۴۔ بیان المختصر شرح مختصر ابن الحاجب الاصفہانی، محمود بن ربیع: ۱/۲۱۰

۵۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب فی من نام عن صلوٰۃ اونسیھا، ۴۳۵؛ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب من نسی الصلوۃ فلیصل اذ ذکرھا، ۵۹۷؛ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب قضاء الصلوٰۃ الفائتۃ، ۱۱۰۶

۶۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صوم داوٗد، ۱۹۷۹؛ صحیح مسلم: ۱۱۵۹

۷۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیائ، باب قولہ تعالیٰ وَ ھَلۡ اَتٰـکَ حَدِیۡثُ مُوۡسٰی: ۳۳۹۷

۸۔ ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول، ص ۲۱۰

۹۔ الاحکام فی اصول الاحکام: ۴/۱۹۰؛ اصول البزدوی، ص ۲۳۲؛ المستصفی من علم الاصول، ۱/۱۵۲؛ البحر المحیط فی اصول الفقہ: ۶/۴۱

۱۰۔ سنن ابی داوٗد، کتاب الاقضیۃ، باب اجتہاد الرأی فی القضائ، ۲۵۹۲

۱۱۔ مسند احمد: ۳/۳۳۸

۱۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، سورۃ الشوریٰ، حاشیہ نمبر ۲۰

۱۳۔ فتح الباری بشرح صحیح البخاری: ۱۱/۴۸

۱۴۔ صحیح بخاری، کتاب الغسل، باب من اغتسل عریاناً۔۔۔؛ صحیح مسلم: ۳۳۹

۱۵۔ حوالہ سابق

۱۶۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب من احب الدفن فی الارض المقدسۃ اونحوھا، ۱۳۳۹، کتاب احادیث الانبیائ، باب وفاۃ موسی وذکرہ بعدہ، ۳۴۰۷، صحیح مسلم: ۲۳۷۲

۱۷۔ صحیح بخاری، ابواب التہجد، باب من نام عند السحر، ۱۱۳۱

۱۸۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشورائ، ۲۰۰۴، صحیح مسلم، ۱۱۳۰

۱۹۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی، ۳۵۵۸

۲۰۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، باب فرض الجمعۃ، ۸۷۶

☆☆☆

بحث ونظر

حکم رانوں کا عدالتی استثناء

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک جائزہ)

جناب مقبول حسن

عدالتی استثناء (Judicial Immunity) سے مراد ہے قاضی (judge) کی طرف سے عدل کے معروف طریقے سے ہٹ کر کسی کے ساتھ بہ وجوہ خصوصی برتاؤ کرنا اور اسے عام قانون وضابطے سے بالاتر جانتے ہوئے عدالتی عمل سے بری الذمہ اور مستثنیٰ قرار دینا۔ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے اسلامی تعلیم وتربیت کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اور لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا کم ہوتا چلا گیا، ذاتی اغراض اجتماعی مقاصد پر غالب آتی گئیں، طبقاتی کش مکش اور تعصّبات کا غلبہ ہو گیا تو لوگوں نے یہ قاعدہ گھڑلیا کہ حکومت کے اعلیٰ عہدے دار اس سے مستثنیٰ ہیں۔ سپریم کورٹ بار، پاکستان کے سابق صدر بیرسٹر اعتزاز احسن کے مطابق ''فی زمانہ دنیا کے تمام ممالک کا یہ قانون (بن چکا) ہے کہ جب تک کوئی شخص مملکت کا سربراہ ہے، اس وقت تک وہ کسی بھی قانون کی گرفت سے بالاتر ہے اور وہ عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ ہے اور عدالت اسے طلب نہیں کرسکتی۔ لہٰذا ایسی صورت میں وہ عدالت میں اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتا۔ بنا بریں اس پر کسی قسم کا مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا۔'' [۱]

پاکستان میں کچھ عرصے سے صدارتی استثناء کا معاملہ عدالتوں میں زیرِ بحث ہے۔ آئینِ پاکستان میں بھی صدرِ پاکستان اور تمام گورنروں کو اپنے عہدے کی مدت کے دوران ہر طرح کے فوج داری مقدمات اور گرفتاری سے استثناء حاصل ہے۔ [۲]

اس معاصر قانونی نظریے اور قانون وضابطے کی بنا پر درج ذیل سوالات ابھرتے ہیں:

۱۔ کیا کسی خاص شخص کو عدالتی و قانونی استثناء حاصل ہوسکتا ہے؟

۲۔ کیا سربراہِ مملکت/حکومت، قانون سے بالا اور عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ ہے؟

۳۔ کیا عدالت کسی مقدمے میں سربراہِ مملکت کو بھی طلب کرسکتی ہے اور اسے بھی قانون کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے؟

۴۔ کیا سربراہِ مملکت کو یہ تحفظ اور قانون سے استثناء دینا قانونِ فطرت اور عدل و انصاف کے اُصولوں کے سراسر منافی نہیں ہے؟

اس مقالہ میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی کہ اسلام اس سلسلے میں ہماری کیا راہ نمائی کرتا ہے؟ اسلامی تعلیمات، اسلامی تاریخ اور اسلامی عدالتی روایات کی روشنی میں ان سوالات کا کیا جواب ملتا ہے؟

تمام انسان برابر ہیں

جب ہم اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں تمام انسان مساوی ہیں اور کسی شخص کو کسی دوسرے پر سوائے تقوی کے کوئی فضیلت اور ترجیح حاصل نہیں ہے، خواہ وہ سربراہِ مملکت ہو یا کوئی عام شخص۔ ارشادِ ربانی ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّاُنۡثٰی وَجَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ۔ (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی عدالتوں نے نہ صرف وقت کے حکمرانوں کو بلا استثناء عدالت میں طلب کیا، بلکہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان کے خلاف فیصلے بھی صادر فرمائے، جن کو انہوں نے نہ صرف خندہ پیشانی سے قبول کیا، بلکہ اسلامی عدالتوں کے ان عدل و انصاف پر مبنی فیصلوں کی توصیف و تعریف بھی فرمائی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا کہ عدل و انصاف پر مبنی ان فیصلوں سے متاثر ہوکر متعدد لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

عدل کے بارے میں قرآنی احکام

قرآن مجید میں جابجا اللہ تعالیٰ نے بلا تفریق عدل و انصاف کرنے اور حق کا ساتھ دینے کا حکم دیا ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَقُل آمَنتُ بِمَا اَنزَلَ اللہُ مِن کِتٰبٍ وَاُمِرتُ لِاَعدِلَ بَینَکُم۔ (الشوریٰ: ۱۵)	اور کہہ دیجیے! اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے، میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے تمہارے درمیان انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔
وَاِذَا حَکَمتُم بَینَ النَّاسِ اَن تَحکُمُوا بِالعَدلِ۔ (النسائ: ۵۸)	اور جب بھی تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔
وَاِن حَکَمتَ فَاحکُم بَینَھُم بِالقِسطِ۔ اِنَّ اللہَ یُحِبُّ المُقسِطِین۔ (المائدۃ: ۴۲)	اور اگر آپ ان لوگوں کے درمیان کوئی فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔
قُل اَمَرَ رَبِّی بِالقِسطِ۔ (الاعراف: ۲۹)	کہہ دے کہ میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے۔
یٰاَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوّٰمِینَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالقِسطِ۔ وَلَا یَجرِمَنَّکُم شَنَاٰنُ قَومٍ عَلٰی اَلَّا تَعدِلُوا اِعدِلُوا ھُوَ اَقرَبُ لِلتَّقوٰی۔ وَاتَّقُوا اللہَ اِنَّ اللہَ خَبِیرٌ بِمَا تَعمَلُونَ۔ (المائدۃ: ۸)	اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے لیے حق پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن کر رہو، اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو، یہی تقویٰ کے بہت زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک تم جو عمل کرتے ہو، اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔
اِنَّ اللہَ یَامُرُ بِالعَدلِ وَالاِحسَانِ۔ (النحل: ۹۰)	بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

عدل و انصاف کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ

اسلام نے عدل و انصاف کے تقاضوں کی خاطر کسی کو بھی شریعت و قانون سے بالاتر قرار نہیں دیا۔ عام سربراہِ مملکت تو دور کی بات ہے، دنیا کی سب سے عظیم ہستی، پیغمبرِ خدا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس نظامِ عدل سے بالاتر نہیں سمجھا۔ آپؐ نے ایک موقع پر اپنے آپ کو صحابہ کرامؓ کے سامنے

پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر کوئی شخص مجھ سے کسی قسم کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو لے لے؟ ایک شخص کھڑا ہوگیا اور کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ایک بار آپؐ نے مجھے چھڑی ماری تھی، میں اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بدلہ لینے کی اجازت دے دی۔ اس شخص نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب آپ نے چھڑی ماری تھی تو اس وقت میرے جسم پر کپڑا نہیں تھا، جب کہ آپ کے جسم پر قمیص ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قمیص اتاری اور فرمایا: اب بدلہ لے لو۔ تب وہ صحابی آپ کے جسمِ اطہر کے ساتھ لپٹ گئے اور اس کا بوسے لینے لگے اور کہا: یارسول اللہ! میرا مقصد تو یہ تھا۔'' ۳؎

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی صاحب زادی سیدہ فاطمہؓ بہت محبوب تھیں، لیکن آپؐ نے ایک موقع پر عدل وانصاف کے قیام میں بطورِ خاص ان کی مثال بیان فرمائی۔ سیدہ عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ قبیلۂ بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی اور اس کا جرم ثابت ہوگیا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم جاری فرمایا۔ اس کے قبیلے والوں نے سوچا کہ اگر اس عورت کا ہاتھ کٹ گیا تو ہماری ہر جگہ رسوائی ہوجائے گی۔ چنانچہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منظورِ نظر صحابی حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لیے آپؐ کے پاس بھیجا کہ اس عورت کا جرم معاف کردیا جائے۔ جب انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اس کے معاملے میں سفارش پیش کی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''**اتشفع فی حد من حدود اللہ؟** (کیا تم اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی حد کے بارے میں سفارش کرنے آئے ہو؟)۔ پھر آپؐ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا، جس میں فرمایا:

انما اھلک الذین قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف أقاموا علیہ الحد، وایم اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرقت لقطعتُ یدھا۔'' ۴؎

تم سے پہلے لوگوں کو اس چیز نے تباہ و برباد کردیا کہ جب ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرلیتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کم زور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کردیتے۔ اللہ کی قسم، اگر فاطمہ بنتِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا۔

عادل حکم راں کے لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

فِاذا عدل کان لہ الأجر۔ ۵؎

اگر وہ عدل کرے گا تو اس کے لیے اجر ہے۔

اسی طرح آپؐ نے ارشاد فرمایا:

فان عدلوا فَلِاَنْفسهم،وان ظلموا فعليها۔"٦	اگر وہ انصاف کریں تو یہ انہی کے حق میں (فائدہ مند) ہے اور اگر ظلم کریں تو اس کا وبال ان پر ہوگا۔

لوگوں کے درمیان صلح صفائی اور عدل و انصاف کے بارے میں آپؐ نے ارشادفرمایا ہے:

يعدل بين الناس صدقة۔ ٧	آدمی لوگوں کے درمیان انصاف کرے۔ یہ صدقہ ہے۔

عدل اور خلفاءِ راشدین کا تعامل

خلفائے راشدین نے بھی اپنے آپ کو اس نظامِ عدل سے کبھی بالاتر نہیں سمجھا اور اپنی ذات کو قانون وشریعت سے مستثنیٰ نہیں رکھا، کیونکہ قرآن وسنت میں اس کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ ایک موقع پر امیرالمؤمنین سیدنا عمر بن خطابؓ نمازِ جمعہ کے لیے جا رہے تھے۔ جب سیدنا عباسؓ کے گھر کے پاس سے گزرے تو اس کے پرنالے سے گرنے والی گندگی سے ان کے کپڑے خراب ہوگئے۔ حضرت عمرؓ نے اس پرنالے کو اُکھاڑنے کا حکم دے دیا۔ گھر واپس لوٹ کر دوسرے کپڑے پہن کر آئے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "یہ پرنالہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جگہ خود لگایا تھا۔" یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے اپنی بات سے رجوع کرلیا اور پرنالہ دوبارہ وہیں لگوا دیا۔ ٨

ایک بار حضرت عمر بن خطابؓ نے لوگوں کے سامنے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "لوگو! تم بہت زیادہ مہر کیوں مقرر کرنے لگے ہو، حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے صحابہ چار سو درہم یا اس سے کم مہر مقرر کیا کرتے تھے۔ اگر زیادہ مہر مقرر کرنا عزت و افتخار کا باعث ہوتا تو تم ان سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے۔ یہ کہہ کر آپ منبر سے نیچے اتر آئے۔ ایک قریشی عورت کھڑی ہوگئی اور کہا: اے امیرالمؤمنین! آپ عورتوں کے مہر کی حد مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ نے قرآنِ مجید کی یہ آیت نہیں سنی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ آتَيْتُم اِحْدٰ هُنَّ قِنطَارًا فَلَاتَاخُذُو امِنهُ شَيئاً۔ (النساء:٢٠) (خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔) یہ سنتے ہی سیدنا عمرؓ نے

استغفار کیا اور کہا: ''ہر شخص عمر سے زیادہ فقیہ ہے''۔ دوبارہ منبر پر چڑھے اور فرمایا: لوگو! میں نے تمھیں چار سو درہم سے زیادہ مہر دینے سے منع کیا تھا۔ میں اپنی بات واپس لیتا ہوں۔ اب جو جتنا چاہے، اپنے مال سے مہر دے سکتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں: اِمرأۃ أصابت ورجل أخطأ۔ ''عورت نے درست بات کہی اور مرد نے خطا کی۔''۹؎

خلفاے راشدین جہاں اپنے آپ کو آئین وقانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے، وہیں وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شرفاء اور عام مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اگر کسی حکومتی عہدے دار کے خلاف کوئی شکایت ملتی تو فوراً اس کی تحقیق کرتے اور ذمہ داران کو سزا دیتے۔ حتیٰ کہ اگر کسی حکومتی عہدے دار پر کوئی بھی معمولی الزام آتا تو فوراً اسے معزول کردیتے، تاکہ عدل کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے اور اس کا عہدہ عدل کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔

ایک موقع پر امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے حج کے موقع پر تمام گورنروں کو طلب کیا اور مجمع عام میں کھڑے ہوکر اعلان فرمادیا: ''اگر کسی مسلمان کو ان کے خلاف ظلم کی کوئی شکایت ہو تو وہ پیش کرے''۔ مجمع میں سے ایک شخص اُٹھا اور اس نے کہا: ''آپ کے گورنر عمرو بن عاصؓ نے مجھے ناحق سو کوڑے لگوائے ہیں، میں ان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں''۔ خلیفۂ وقت نے کہا کہ اُٹھو اور اپنا بدلہ لے لو۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے کہا: ''اے امیر المؤمنین! آپ گورنروں کے خلاف یہ راستہ نہ کھولیں''۔ مگر سیدنا عمرؓ نے فرمایا: میں نے خود نبی کریم ﷺ کو اپنے آپ سے بدلہ لیتے دیکھا ہے۔ اے شخص! اٹھ اور اپنا بدلہ لے۔ آخر کار حضرت عمرو بن عاصؓ کو ہر کوڑے کے بدلے میں دو، دو اشرفیاں دے کر جان بچانی پڑی۔ ۱۰؎

ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہوگیا۔ ان دونوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو منصف مقرر کرلیا کہ جو وہ فیصلہ کریں گے، وہ ہمیں قبول ہے۔ چنانچہ دونوں صحابہ کرامؓ حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس گئے اور ان کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ حضرت زید

بن ثابتؓ نے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے احترام میں اُنہیں اپنے ساتھ بٹھانا چاہا، مگر انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے فریق کے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔ چنانچہ یہ دونوں اصحاب بطور مدعی اور مدعا علیہ سیدنا زید بن ثابتؓ کے سامنے بیٹھ گئے۔ سیدنا ابی بن کعبؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا، جب کہ سیدنا عمرؓ بن خطاب نے اس دعویٰ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سیدنا زید بن ثابتؓ نے سیدنا ابی بن کعبؓ سے کہا: آپ امیر المؤمنین سے درگزر فرمائیں اور اپنا دعویٰ واپس لے لیں۔ شرعی ضابطے کے مطابق حضرت زیدؓ کو سیدنا عمرؓ بن خطاب سے قسم لینی چاہیے تھی، لیکن انہوں نے احتراماً اس سے احتراز کیا تو حضرت عمرؓ نے خود قسم کھائی، پھر فرمایا: اللہ کی قسم! زید اس وقت تک منصبِ قضا کے لائق نہیں ہو سکتے جب تک ان کے نزدیک امیر المؤمنین عمرؓ اور ایک عام مسلمان برابر نہ ہوں۔ ۱۱ے

اہل کوفہ نے امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطابؓ کی عدالت میں کوفہ کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی شکایت کی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُنھیں معزول کر کے ان کی جگہ حضرت عمارؓ کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ اہل کوفہ کی شکایتوں میں یہ بات بھی تھی کہ وہ نماز اچھی طرح سے نہیں پڑھاتے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو بلا بھیجا اور پوچھا: اے ابواسحق! یہ کوفہ والے شکایت کرتے ہیں کہ آپ اچھی طرح سے نماز نہیں پڑھا سکتے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں اُنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز پڑھایا کرتا تھا اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کرتا تھا۔ میں عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں قراءت لمبی کرتا ہوں اور آخری دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اے ابواسحق! آپ کے بارے میں میرا یہی گمان ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ساتھ ایک آدمی کوفہ روانہ کیا۔ اُنہوں نے تمام مسجدوں میں گھوم کر اہل کوفہ سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے متعلق پوچھا اور سب نے ان کے متعلق تعریفی کلمات کہے۔ لیکن بنو عبس کی مسجد میں ابو سعد اسامہ بن قتیبہ نامی شخص نے کہا: جب آپ ہمیں قسم دے کر ان سے متعلق ہماری شکایت معلوم کرتے ہیں تو ہماری شکایت یہ ہے کہ سعد جنگ میں نہیں جاتے تھے، مالِ غنیمت برابر تقسیم نہیں کرتے تھے اور

انصاف کے ساتھ فیصلہ نہیں کرتے تھے۔حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اس کی بات سن کر کہا: اللہ کی قسم! تو نے تین جھوٹی شکایتیں کی ہیں، میں بھی تجھے تین بددعائیں دیتا ہوں : ''اے اللہ! اگر تیرا یہ بندہ جھوٹا ہے اور اس نے ریا کاری اور شہرت کے لیے میری شکایت کی ہے تو اس کی عمر لمبی کر، اس کو فقر میں مبتلا کر اور اسے فتنوں کا شکار بنا دے۔'' روایت میں ہے کہ اس آدمی کو حضرت سعد کی بددعا لگ گئی۔ جب اس سے پوچھا جاتا تو وہ کہتا: ''بوڑھا آدمی ہوں، آزمائش میں ڈالا گیا ہوں، سعد کی بددعا مجھے لگ گئی ہے''۔ یہ آدمی اتنا بوڑھا ہوگیا تھا کہ اس کی آنکھوں کی پلکیں گر چکی تھیں۔ ۱۲؎

مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوا کہ کوفہ کے گورنر سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ بالکل بے قصور تھے اور ان پر لگائی جانے والی تہمت جھوٹی تھی ،لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے عدل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انہیں معزول کر دیا اور ان کے بارے میں اچھا گمان رکھنے کے باوجود اس تہمت کی تحقیق کروائی۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیش آیا۔ آپؓ مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے، ایک آدمی وہاں سے گزرا جو کہہ رہا تھا۔''اے عمر! تمہارے لیے 'ویل' (جہنم کا ایک حصہ) ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس آدمی کو میرے پاس لایا جائے۔ اسے لایا گیا تو آپؓ نے پوچھا: تم نے یہ بات کیوں کہی ہے؟ وہ کہنے لگا: آپ حکام مقرر کرتے وقت انھیں شرائط کا پابند تو کرتے ہیں، مگر ان کا محاسبہ نہیں کرتے کہ انہوں نے وہ شرائط پوری کی ہیں یا نہیں۔ اس پر امیر المؤمنین نے اس سے دریافت کیا: آخر بات کیا ہے؟ اس نے بتایا: آپ کے مصری گورنر نے ان شرائط کو فراموش کر دیا ہے اور آپ کے منع کردہ امور کا ارتکاب کیا ہے۔ سیدنا عمرؓ نے یہ شکایت سننے کے فوراً بعد دو انصاری صحابہ کو مصر روانہ کیا کہ وہاں جا کر تفتیش کریں اور اگر اس آدمی کی بات درست نکلے تو مصر کے گورنر کو گرفتار کر کے ان کی خدمت میں لائیں۔ ان لوگوں نے مصر کے گورنر کو گرفتار کر کے امیر المؤمنین سیدنا عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت عمرؓ اسے پہچان نہیں پائے۔ کیونکہ مصر کا حاکم بن کر جانے سے قبل وہ گندمی رنگ کا تھا، مگر جب مصر کی سرسبزی وشادابی اسے

راس آئی تو وہ گورا چٹا اور بھاری بھرکم انسان بن گیا۔ امیر المؤمنین نے فرمایا: تیرا ستیاناس ہو۔ جس بات سے تجھے منع کیا گیا اس کو تو نے گلے لگا لیا، مگر جس بات کا حکم دیا گیا تھا اس کو تو فراموش کر بیٹھا۔ اللہ کی قسم! میں تجھے ضرور عبرت ناک سزا دوں گا۔ پھر انھوں نے اون کا ایک پھٹا ہوا لباس، ایک لاٹھی اور صدقے میں آئی ہوئی تین سو بکریاں منگوا کر اس حاکم مصر سے فرمایا: ''یہ لباس پہنو، میں نے تیرے باپ کو اس سے بھی خراب لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ لاٹھی اٹھاؤ جو تیرے باپ کی لاٹھی سے بہتر ہے اور فلاں چراگاہ میں جا کر ان بکریوں کو چراؤ'' وہ آدمی فوراً زمین پر گر گیا اور کہنے لگا: اے امیر المؤمنین! یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا، چاہے آپ میری گردن اُڑا دیں۔ امیر المؤمنین نے فرمایا: ''اگر میں تمھیں گزشتہ منصب پر بحال کردوں تو پھر تم کس طرح کے آدمی بن کر رہو گے؟ اس نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! اب اس کے بعد آپ تک وہی بات پہنچے گی جو آپ پسند کریں گے۔'' چنانچہ اس کے بعد وہ آدمی مصر کا ایک مثالی گورنر بن گیا اور اپنی ذمہ داریاں خوف و تقویٰ اور اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ انجام دینے لگا۔ ۱۴۳؎

اسلامی عدالتوں کا عدل وانصاف پر مبنی ایسا ہی ایک مشہور واقعہ حضرت علیؓ کے عہد میں پیش آیا، جس میں آپؓ سربراہِ حکومت اور امیر المؤمنین ہونے کے باوجود بطورِ ایک فریق عدالت میں حاضر ہوئے اور گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں آپؓ کے خلاف فیصلہ صادر کردیا گیا، جسے آپؓ نے برضا وخوشی قبول کرلیا۔ تفصیل یوں ہے کہ ایک بار حضرت علیؓ کی زرہ گم ہوگئی۔ آپ نے اسے ایک یہودی کے پاس دیکھا تو اس سے کہا کہ یہ میری زرہ ہے، فلاں دن گم ہوگئی تھی۔ اس نے آپؓ کا دعویٰ درست ماننے سے انکار کردیا۔ طے ہوا کہ فیصلہ عدالت میں ہوگا۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور وہ یہودی دونوں فیصلے کے لیے قاضی شریحؒ کی عدالت میں پہنچے۔ حضرت علیؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا کہ یہودی کے پاس جو زرہ ہے وہ میری ہے، جو فلاں دن گم ہوگئی تھی۔ قاضی نے یہودی سے پوچھا: آپ کو کچھ کہنا ہے۔ یہودی نے کہا: میری زرہ میرے قبضے میں ہے اور میری ملکیت ہے۔ قاضی شریحؒ نے فرمایا: اے امیر المؤمنین! قانون کے تقاضوں کو پورا کرنا آپ پر واجب

ہے۔ آپ گواہ پیش کریں۔ حضرت علیؓ نے بطورِ گواہ اپنے غلام قنبر اور اپنے دو بیٹوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو پیش کیا۔ اُنھوں نے بھی آپ کے حق میں گواہی دی۔ قاضی شریح نے کہا: میں آپ کے غلام کی گواہی تو قبول کرتا ہوں، مگر آپ کے حق میں آپ کے بیٹوں کی گواہی ناقابل قبول ہے۔ ایک اور گواہ پیش کیجیے۔ حضرت علیؓ نے کہا: میں نے عمر بن خطابؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے: ''حسنؓ اور حسینؓ نوجوانانِ اہل جنت کے سردار ہیں۔'' قاضی شریح نے کہا: اللہ کی قسم! یہ بالکل حق ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: تو پھر آپ ان کی گواہی قبول کیوں نہیں کرتے؟ قاضی شریح نے کہا: یہ دونوں آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ یہ کہہ کر قاضی شریح نے ان کے خلاف اور یہودی کے حق میں فیصلہ سنا دیا اور زرہ یہودی کے حوالے کر دی۔ یہودی نے تعجب سے کہا: مسلمانوں کا حکم راں مجھے اپنے قاضی کی عدالت میں لایا اور قاضی نے اس کے خلاف میرے حق میں فیصلہ صادر کردیا اور امیر المؤمنین نے اس کا فیصلہ بلاتوقف قبول بھی کرلیا۔ واللہ، یہ تو پیغمبرانہ عدل ہے۔ پھر یہودی نے حضرت علیؓ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: امیر المؤمنین! آپ کا دعویٰ بالکل سچ ہے۔ یہ زرہ یقینا آپ ہی کی ہے۔ فلاں دن یہ آپ کے اونٹ سے گرگئی تھی تو میں نے اسے اٹھا لیا تھا۔ اس مبنی بر عدل فیصلے سے متاثر ہوکر وہ یہودی مسلمان ہوگیا۔ [۱۴]

حکم رانوں اور رعایا کے درمیان نظامِ عدل اور قانونی مساوات کا یہ سلسلہ خلافتِ راشدہ کے بعد بھی پوری آن بان کے ساتھ جاری رہا۔ حکم راں عدالتوں میں پیش ہوتے رہے اور قانون کا سامنا کرتے رہے۔

عدل اور دیگر مشاہیرِ اسلام

عتبی بیان کرتے ہیں کہ وہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے قاضی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ان کی عدالت میں دو آدمی حاضر ہوئے۔ ایک ابراہیم بن محمد تھا اور دوسرا خلیفہ ہشام کا درباری سپاہی۔ دونوں عدالت میں پہنچ کر قاضی کے سامنے بیٹھ گئے۔ درباری سپاہی بولا: قاضی صاحب! امیر المؤمنین اور ابراہیم کے درمیان ایک

تنازعہ ہے۔ امیر المؤمنین نے مجھے اپنی نیابت کے لیے بھیجا ہے۔ قاضی نے کہا: تمہاری نیابت پر دو گواہ مطلوب ہیں۔ درباری سپاہی بولا: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں امیر المؤمنین کی طرف سے کچھ جھوٹ بولوں گا، حالاں کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی دور کا فاصلہ نہیں ہے، میں ان کا قریبی سپاہی ہوں۔ قاضی نے کہا: شہادت کے بغیر نہ تمہارے حق میں مقدمہ ہوسکتا ہے اور نہ تمہارے خلاف۔ قاضی کا دوٹوک فیصلہ سن کر درباری سپاہی عدالت سے نکل گیا اور خلیفہ کی خدمت میں پہنچ کر پوری داستان سنائی۔ خلیفہ اُٹھ کھڑا ہوا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ عدالت کے باہر موجود تھا۔ عدالت کا دروازہ کھلتے ہی درباری سپاہی آگے بڑھا اور بولا: قاضی صاحب! یہ دیکھیے، امیر المؤمنین حاضر ہیں۔ خلیفہ ہشام کو دیکھتے ہی قاضی صاحب استقبال کے لیے کھڑے ہوگئے، مگر خلیفہ نے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ پھر قاضی نے ایک مصلیٰ بچھایا، اس پر خلیفہ اور اس کا فریق مخالف ابراہیم بن محمد بیٹھ گئے۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم حاضرین اس قضیے سے متعلق ہونے والی گفتگو صاف صاف نہیں سن رہے تھے، البتہ کچھ باتیں ہمیں سمجھ میں آرہی تھیں۔ فریقین نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ قاضی نے مفصل گفتگو سننے کے بعد خلیفہ ہشام کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ ۱۵؎

ایک موقع پر اہل سمرقند نے اسلامی لشکر کے سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کے خلاف اسلامی عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ قاضی نے مسجد کے ایک کونے میں اپنی نشست سنبھالی اور کارروائی کا آغاز کردیا۔ قاضی کا غلام اس کے سر پر کھڑا ہے۔ بغیر کسی لقب کے امیر لشکر کا نام لے کر بلایا جارہا ہے کہ وہ حاضر ہو۔ امیر لشکر فاتحِ سمرقند قتیبہ بن مسلم حاضر ہوا۔ عدالت نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اہل سمرقند کے سردار کاہن کو بلوایا اور قتیبہ بن مسلم کے ساتھ بٹھا دیا۔ عدالت نے اپنی کارروائی شروع کی۔

قاضی اپنی نہایت پست آواز میں قاضی کاہن سے مخاطب ہوئے: بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟

کاہن: آپ کا کمانڈر قتیبہ بن مسلم ہمارے ملک میں دھوکے سے داخل ہوا ہے۔ اعلانِ جنگ نہیں کیا اور نہ ہمیں اسلام کی دعوت دی ہے۔

قاضی نے امیر کی طرف دیکھا اور پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟

امیر لشکر: لڑائی تو دھوکہ ہوتی ہے۔ یہ ملک بہت بڑا ہے۔ اس کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ نے ہماری وجہ سے کفر و شرک سے محفوظ کیا ہے اور اسے مسلمانوں کی وراثت اور ملکیت میں دے دیا ہے۔

قاضی: کیا تم نے حملے سے پہلے اہلِ سمرقند کو اسلام کی دعوت دی تھی، یا جزیہ دینے پر آمادہ کیا تھا، یا دونوں صورتوں سے انکار پر جنگ کا اعلان کیا تھا؟

امیر لشکر: نہیں، ایسا تو نہیں ہوا۔

قاضی: تو گویا آپ نے اپنے قصور کا اعتراف کرلیا۔

اس کے بعد قاضی نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کی مدد اس لیے کی ہے کہ اس نے دین کی اتباع کی اور دھوکہ دہی سے اجتناب کیا۔ اللہ کی قسم! ہم اپنے گھروں سے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے ہیں۔ ہمارا مقصود زمین پر قبضہ جمانا نہیں اور نہ حق کے بغیر وہاں حکومت کرنا ہے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ مسلمان اس شہر سے نکل جائیں اور شہر اس کے اصل باشندوں کے حوالے کر دیں۔ پھر ان کو دعوتِ اسلام دیں، انھیں جنگ کا چیلنج کریں اور ان سے لڑائی کا اعلان کریں۔''

اہلِ سمرقند نے جو سنا اور دیکھا، اس پر انھیں یقین نہیں آرہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں قاضی کے فیصلے پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا اور فوجیں واپس جارہی تھیں۔ وہ افواج، جن کے سامنے مدینہ سے لے کر سمرقند تک کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی، جنھوں نے قیصر و کسریٰ اور خاقان کی قوتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا، جو رکاوٹ بھی راستے میں آئی، اسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئے، مگر آج وہ ایک کم زور، نحیف جسم کے مالک قاضی کے فیصلے کے سامنے بے دست و پا ہوگئیں۔ اس عادلانہ فیصلے کو دیکھ کر اہل سمرقند نے اسلامی فوج کے راستے روک لیے، ان کے گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں کہ ہمارے ملک سے واپس نہ جائیں۔ ہمیں اسلامی عدل و انصاف کی ضرورت ہے۔ پھر چشم فلک نے وہ منظر بھی دیکھا کہ سمرقند کی گلیاں اور چوک اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اُٹھے، لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ ۱۶؎

عہدِ اسلام کے اس زرّیں دور میں بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ سر براہِ مملکت اور حکم ران عدالت میں بطورِ گواہ حاضر ہوتا ہے، مگر اس کی گواہی کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اسی دور کی ایک عدالت کا نقشہ کچھ یوں ہے:

قسطنطنیہ میں، جو مسلمانوں کی سلطنتِ عثمانیہ کا دارالحکومت تھا، عدالت لگی ہوئی ہے۔ قاضی شمس الدین محمد حمزہ کرسیٔ عدالت پر براجمان ہیں۔ مقدمہ پیش ہوا۔ قاضی نے گواہوں کی فہرست دیکھی۔ اس کے اندر حاکم وقت سلطان بایزید کا نام بھی شامل تھا۔ سامنے دیکھا تو وہ گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ اچانک قاضی نے فیصلہ سنا دیا: سلطان بایزید کی گواہی کو مسترد کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ حیران اور ششدر رہ گئے۔ سلطان بایزید نے آگے بڑھ کر قاضی کو مخاطب کیا: کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے گواہی کے قابل کیوں نہیں سمجھا گیا ہے؟ قاضی نے حکم راں کی حاکمانہ حیثیت، مقام و مرتبے اور رعب و دبدبے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ''گواہ باجماعت نماز ادا نہیں کرتا، اس لیے اس کی گواہی ناقابل قبول ہے۔'' حاکم نے فیصلہ سنا اور اس کے سامنے گردن جھکا دی۔ اپنی کم زوری کا اعتراف کیا اور حکم دیا کہ فی الفور میرے محل کے سامنے ایک خوب صورت مسجد بنائی جائے۔ اس کے بعد وہ نمازِ باجماعت سے غفلت کا کبھی مرتکب نہیں ہوا۔[۱۷]

تاریخ اسلامی ایسے شان دار اور عدل و مساوات پر مبنی فیصلوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں حکم راں، وزرائ، گورنر اور فوجی سپہ سالار عدالت میں پیش ہوتے اور قاضی کے فیصلوں کے سامنے اپنا سر جھکا لیتے تھے۔ یہ اسلام کا ہی امتیاز ہے کہ اس میں قانونی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ سر براہِ حکومت اور ایک عام شہری کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حکم رانوں کا عدالتی استثناء اور عقل

استثناء کا یہ تصور انسانی عقل کو بھی قبول نہیں کہ قانون کی نظر میں کسی بھی بنیاد پر کسی شخص کو کسی دوسرے پر تفوّق اور قانونی و عدالتی استثناء حاصل ہو۔ اگر سر براہِ حکومت کی مختلف حیثیتوں کا عقلی تجزیہ کیا جائے تو بھی یہ بات قرینِ عقل معلوم نہیں ہوتی۔ مثلاً:

(۱) بطورِ انسان: بطورِ انسان سب مساوی ہیں، خواہ کوئی حکم راں ہو یا رعایا۔ جس طرح عام آدمی قانون کا پابند ہے اُسی طرح صاحبِ حکومت بھی اُسی معاشرے کا فرد ہونے کے ناتے قانون کا پابند ہے اور قانون کا اطلاق اُس پر بھی ویسے ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کیسے امتیازی سلوک کا حق دار ہوسکتا ہے؟

(۲) بطورِ نمونۂ عمل: جو شخص افرادِ ریاست کے معاملات کا ذمہ دار اور حکم راں ہوتا ہے وہ اپنے ماتحتوں اور رعایا کے لیے نمونہ اور مثال ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے لیے قانونی تحفظ اور عدالتی استثناء کا طلب گار ہوگا تو رعایا میں قیامِ عدل کو کیسے ممکن بنائے گا؟ کیونکہ 'الناس علٰی دین ملوکھم'۔۔۔عوام تو حکم رانوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر تو عوام بھی لازماً احترامِ قانون سے تساہل برتیں گے۔ ایسی صورتِ حال میں معاشرہ یقیناً لاقانونیت اور انارکی کا شکار ہوجائے گا، جیسا کہ آج کل ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

(۳) بطورِ قوتِ نافذہ: حکم راں قوت وطاقت کا مرکز ہوتا ہے اور اس کے پاس قوتِ نافذہ ہوتی ہے۔ اگر اسے خود نظم وقانون سے چھوٹ حاصل ہوجائے تو پھر کون سی قوتِ نافذہ باقی رہ جائے گی؟ پھر تو اُس کے پاس کوئی قانونی واخلاقی جواز ہی نہیں رہتا کہ وہ دوسروں کو قانون کا پابند رکھ سکے اور مجرموں کو قانون کے کٹہرے میں لا سکے۔ اس طرح تو وہ حقِ حکم رانی ہی کھو دیتا ہے۔

(۴) حکم راں کا مقام ومرتبہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ حکم راں اپنے مقام ومرتبہ کی وجہ سے انتہائی لائقِ احترام شخصیت ہوتا ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ قانون سے بالاتر ہوجائے۔ ایسا عقل وفطرت کے خلاف ہے۔ عدالت میں خاص طور پر سب سے یکساں سلوک انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ازحد ضروری ہے۔

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنیہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوہ، خلفاءِ راشدین کے تعامل اور مشاہیرِ اسلام اور قضاۃِ اسلام کے تاریخی وعدالتی کردار اور عقلی وفطری استدلال سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام میں اصل حیثیت الٰہی شریعت کو حاصل ہے، جب کہ انسانوں کا بنایا ہوا نظامِ سیاست وجمہوریت، جس کا آج دنیا میں بڑا چرچا کیا جا رہا ہے، اس میں یہ حاکمیت اللہ کے بجائے عوام کے نمائندوں کو حاصل ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے لیے قانون سے بالاتر رہنے کے قواعد بناتے ہیں۔ شریعتِ اسلامیہ

میں قانون کی یہ حاکمیت حکم راں وعہدے دار سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ ؐ کی آل واولاد تک کو محیط ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ آج اُمت اسی لیے زوال پذیر ہے کہ ہم نے اسلام کے زرّیں اُصول بُھلا کر من مانے طریقے ایجاد کر لیے ہیں اور اسلامی تعلیمات اور روایات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

لہٰذا ہر حکم راں، قاضی یا جج پر بھی لازم ہے کہ فیصلہ کرتے وقت وہ ذاتی پسند وناپسند کو دخل دیے بغیر عدل وانصاف کے تمام تقاضے پورا کرے، خواہ اس کا فیصلہ اپنے کسی قریبی، رفیق و عزیز وغیرہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور کسی قسم کے دباؤ یا مصلحت کو قبول نہ کرے، خواہ وہ فیصلہ سربراہِ مملکت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اسلامی نظامِ عدل میں تمام انسان برابر ہیں، سربراہِ مملکت اور ایک عام مزدور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام میں اللہ کی شریعت اور قانون سب سے بالاتر ہیں، جس کا اطلاق قاضی حضرات مسلم خلفاء سمیت ہر فرد پر یکساں طور پر کرتے رہے ہیں۔

خلاصۂ کلام

ہمارے ہاں عدل صرف عدالتوں تک محدود کر دیا گیا ہے، حالاں کہ یہ ایک بہت جامع اور ہمہ گیر معاملہ ہے اور انسانی زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی شعبوں کو محیط ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد معاشرے میں قیامِ عدل وقسط ہے۔ اُممِ سابقہ کی ہلاکت وتباہی کا ایک اہم سبب عدل وقسط سے انحراف اور ظلم وجور کی پشت بانی رہا ہے۔ بے لاگ، بلا تفریق اور بلا استثناء عدل معاشرتی زندگی کی بقا ودوام کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر معاشرے میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا، نہ اس کو برائیوں سے پاک رکھا جا سکتا ہے اور نہ امن وامان قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسُنت میں عدل کے قیام پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اسلام عدالتی استثناء کے کسی تصور کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس میں اللہ کی شریعت اور قانون سب سے بالاتر ہیں۔ اسلامی تاریخ میں حکم رانوں سے بازپرس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ قاضیوں نے بلا تفریق واستثناء سب کے ساتھ یکساں سلوک وانصاف کیا۔

غیر اسلامی دنیا کی تو بات ہی الگ ہے، ہمارے مسلم ممالک کے آئین کے

اندر موجود سربراہِ مملکت کو حاصل تحفظ اور استثناء عدل و انصاف کے سراسر منافی ہے اور قوانین و احکامِ الٰہیہ کا سراسر مذاق ہے۔ مسلمان کے لیے ملکی آئین سے بڑھ کر اللہ کی شریعت یعنی کتاب و سنت اہم ہے۔ مسلم اہل حل وعقد اور اربابِ بست وکشاد کو عدل و انصاف کے منافی اس قانون کے بارے میں سنجیدگی سے غور وفکر کرنا چاہئے اور اسے تبدیل کر دینا چاہئے، تاکہ نہ صرف ہماری مملکتوں میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو اور ہمارے ملک امن وسلامتی کا گہوارہ بن سکیں، بلکہ غیر مسلم دنیا اسلام کے اس بے لاگ عدل کے شان دار ثمرات سے فائدہ اٹھا سکے۔

حواشی و مراجع

۱۔ اعتزاز احسن، بیرسٹر (سابق صدر سپریم کورٹ بار پاکستان)۔ جیو ٹی وی کے مقبول پروگرام 'میرے مطابق' میں این آر او کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ممتاز ٹی وی اینکر ڈاکٹر شاہد مسعود سے گفتگو، ۲۰۰۹ئ۔

۲۔ آئینِ پاکستان، دفعہ ۲۴۸، شق ۲

۳۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۴ھ، (طبع سوم) ص: ۸/۴۸

۴۔ صحیح البخاری، حدیث: ۳۴۷۵

۵۔ خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح، مکتبہ تجاریہ، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۱ء، حدیث نمبر: ۳۷۱۸

۶۔ سنن ابی داؤد، دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۸ئ، حدیث نمبر: ۱۵۸۸

۷۔ صحیح البخاری، دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۸ئ، حدیث نمبر: ۲۷۰۷

۸۔ مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۷۹۰ ۹۔ تفسیر ابن کثیر، سورۃ النساء: ۲۰

۱۰۔ ابویوسف، کتاب الخراج ۱۱۔ سنن البیہقی، ایضاً

۱۲۔ صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۷۵۵

۱۳۔ شمس الدین، ابراہیم، قصص العرب، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۳ھ، ۳/۶

۱۴۔ ابن جوزی، حلیۃ الاولیائ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۳ھ

۱۵۔ شمس الدین، ابراہیم۔ ایضاً: ۳/۴۷

۱۶۔ علی طنطاوی، قصص من التاریخ، المکتب الاسلامی، دمشق، ۱۹۳۹ئ، ص: ۲۰۰

۱۷۔ لینگز، ولیم ایل، مترجم: غلام رسول مہر، انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور، ۱۹۸۵ئ، ج ۱ ص ۶۱، ۶۲

☆☆☆

سیر وسوانح

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ اور مجلس احرارِ اسلام
[ملکی وملّی خدمات کا ایک جائزہ]

ڈاکٹر محمد عرفان قاسمی

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریزوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور ان کو سماجی اور معاشی لحاظ سے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی۔ ان کے عقیدہ اور مذہب کی عمارت کو منہدم کرنے کے لیے تبلیغ عیسائیت کی راہ ہموار کی۔ اس پر آشوب زمانہ میں علماء کرام میدان میں اترے اور انہوں نے قوم کو انگریزی اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تحریک چلائی۔ اسی مقصد سے شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ مولانا عبدالقادر لدھیانوی، قاضی احمداللہ شہید، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی وغیرہ نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان علماء کی کوششوں سے ہی ہندوستانی عوام میں سیاسی شعور اور جذبۂ حریت بیدار ہوا اور ایسا شعلہ بھڑکا جسے دبانا انگریزوں کے بس میں نہ تھا۔ مسلمانوں نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لیا اور زبردست قربانیاں دے کر ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرایا، مگر آزادی کے بعد انھیں پھر سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور وہ مسلمان، جنھوں نے ہندوستان کو ہی اپنا وطن بنانے کا فیصلہ کیا، وہ بھی طرح طرح کے مسائل کا شکار ہوئے۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد مسلمانانِ ہند کو مسیحی مشن، شدھی تحریک اور قادیانیت سے بھی سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے تشخص اور ان کی جان مال کی حفاظت میں دینی وملی جماعتوں اور اداروں اور ان سے وابستہ شخصیات نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ملک وملت کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ اس دور میں مجلس احرار اسلام ہند اور اس کے پہلے صدر مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی خدمات ہندوستانی مسلمانوں کی ملی تاریخ کا اہم حصّہ ہے۔

مختصر حالاتِ زندگی

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی پیدائش ۳/جولائی ۱۸۹۲ء مطابق ۱۱/صفر ۱۳۱۰ھ کو لدھیانہ (پنجاب) کے محلہ موج پورہ میں ہوئی۔ آپ کے جد امجد مولانا عبد القادرؒ لدھیانوی، اُن کے دادا مولانا مفتی محمدؒ اور ان کے تینوں بھائی مولانا سیف الرحمنؒ، مولانا شیخ محمد عبد اللہؒ اور مولانا عبد العزیزؒ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ آپ کے والد محترم مولانا محمد زکریا صاحب علم وفضل میں یکتا اور اپنے زمانہ کے مایہ ناز عالم دین تھے۔ پنجاب کے اکثر وبیش تر علماء فہم قرآن وحدیث کے لیے آپ کی مجلس میں حاضر ہوکر علمی فیض حاصل کیا کرتے تھے۔

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے ابتدائی تعلیم مدرسہ حقانی میں حاصل کی، جہاں ناظرۂ قرآن اور اردو وفارسی کی کتابیں پڑھیں۔ پھر جالندھر کے ایک عربی مدرسہ میں پڑھنے کے لیے گئے (جس کا نام کتابوں میں کہیں مذکور نہیں ہے)۔ یہاں آپ نے دو سال تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امرتسر گئے۔ آخر میں دار العلوم دیو بند تشریف لے گئے اور وہاں پانچ سال رہ کر مختلف علوم فنون کی کتابیں پڑھیں۔ ان کے اساتذہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ، علامہ ابراہیمؒ بلیاوی، مولانا سراج احمدؒ، مولانا میاں اصغر حسین دیو بندیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دار العلوم دیو بند کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا کو چند اہم بزرگوں کی سیاسی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا حبیب الرحمن عثمانی سے روابط ان کی سیاسی زندگی کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے۔ طالب علمی کے آخری دور میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی رفاقت حاصل رہی اور ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف سیاسی اور مذہبی پروگراموں میں شرکت کی۔ یہ تحریک خلافت کا ابتدائی دور تھا۔ یہیں سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔

سیاسی سرگرمیاں

بیسویں صدی کا بیسواں سال (۱۹۱۹) ہمیشہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں 'صبح صادق' تسلیم کیا جائے گا، کیوں کہ اسی سال ماہ مارچ میں ستیہ گری کی تجویز منظور کی گئی۔ اسی سال جمعیۃ علماء ہند کے نظام جدید کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اسی سال جلیان والا باغ کا وہ مشہور حادثہ پیش آیا، جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار ہندوستانیوں نے جنگ آزادی کی مردہ تحریک میں مظلوم ومعصوم خون کے انجکشن سے جان ڈالی اور ایک کامیاب تحریک کی آبیاری کی۔ ۲؎

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ چوں کہ جلیاں والا باغ کا خونی حادثہ کچھ ہی عرصہ پہلے پیش آیا تھا، اس لیے تمام رہ نماؤں نے آپسی اختلافات کو ختم کر کے آزادئ وطن کے لیے مشترکہ جد و جہد کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے میں وائسرائے ہند نے ایک آرڈی ننس جاری کیا کہ:

> ''جو شخص خلافت، کانگریس اور جمعیۃ علماء کا والنٹیر بنے اس کو چھ ماہ قید اور جو والنٹیر بنائے گا اس کو تین سال قید کی سزا دی جائے گی''۳؎

اس تحریک کی ابتدا میں مولانا حبیب الرحمن کو والنٹیر بننے اور بنانے کے جرم میں ۲۲/دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح ان کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا اور تھوڑے دنوں بعد چھ ماہ کی قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اس عرصے میں آپ لدھیانہ، انبالہ، میانوالی، دھرم سالہ اور گجرات کی جیلوں میں رہے۔ سزا ختم ہونے سے دو روز قبل ایک دوسرے مقدمے کے لیے دفعہ ۱۰۸/ کے تحت وارنٹ دکھلا کر آپ کو جیل میں روک لیا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد ایک سال کی قید کی سزا کا حکم سنا کر ۲۰/اگست ۱۹۲۲ء کو پھر دھرم سالہ جیل میں پہنچا دیا گیا، جہاں سے ۱۶/اگست ۱۹۲۳ء کو آپ کی رہائی ہوئی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ گاندھی جی نے ۱۳/مارچ ۱۹۳۰ء کو نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے اس سے دو روز پیشتر لدھیانہ کے ہزاروں عوام کی موجودگی میں دریائے ستلج کے کنارے نمک بنا کر انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کیا تھا۔ حکومت کے نزدیک ان کا یہ عمل قابل مواخذہ سمجھا گیا۔ لہٰذا ۲۳/اپریل ۱۹۳۰ء کو دفعہ ۱۰۸/ اور ۱۲۴/ کے تحت انھیں ان کے

مکان سے گرفتار کر کے جیل میں مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران ۲۷/مئی ۱۹۳۰ء کو لدھیانہ جیل میں لالہ وڈّیا ساگر مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں مولانا نے حسب ذیل بیان دیا:

> ''میں حکومت انگریز کو ایک ایسی غیر ملکی حکومت سمجھتا ہوں، جس نے اپنی چال بازیوں اور طاقت کے بل پر ہندوستان کو غلام بنائے رکھا۔ میں اپنے لیے اور ہندوستانیوں کے لیے یہ فرض سمجھتا ہوں کہ انگریز گورنمنٹ کو جس ممکن طریق سے بھی ہم نکال کر ہندوستان کو آزاد کرائیں۔ اس بارے میں جو سزا بھی ہم کو ملے، ہم اسے بخوشی قبول کریں۔۔۔۔ میرا عقیدہ ہے کہ سچائی کے اجلے دامن پر برطانوی حاکمیت و طاقت ایک سیاہ داغ ہے اور اس داغ کو دھونا اگر جرم ہے تو میں اقرارِ جرم کرتا ہوں اور قانونِ عدالت کو اپنی منشا پوری کرنے کی اجازت دیتا ہوں'' [۴]

مولانا لدھیانوی کا یہ بیان تحریری شکل میں تھا۔ اس پر انھیں ایک سال قید کی سزا ہوئی اور انہیں لدھیانہ جیل سے گجرات جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں انہیں ڈاکٹر انصاری کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اور یہیں سے ڈاکٹر صاحب سے مولانا کے تعلقات بڑے گہرے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ جیل میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس گرفتاری سے وہ مئی ۱۹۳۱ء کو رہا ہوئے۔

مجلس احرار اسلام کی تاسیس اور اس کے تحت سرگرمیاں

مجلس احرار اسلام کے قیام ۱۹۲۹ء کے بعد احراری رہ نما کانگریس کی طرف سے شروع کردہ تحریک سول نافرمانی میں مشغول ہو گئے۔ اس سے بہ ظاہر مجلس احرار دب گئی، لیکن جب ۱۹۳۱ء کے شروع میں احراری رہ نما جیلوں سے رہا ہوئے تو انہوں نے از سرِ نو مجلس احرار کو زندہ کرنے کا ارادہ کیا اور پہلے صدر کی حیثیت سے مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کا نام پیش ہوا، جسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ اس طرح وہ مجلس احرار اسلام کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۰ء تک دس سال مولانا لدھیانوی مجلس احرار اسلام کے صدر رہے۔ لیکن ان کی طویل نظر بندی کی وجہ سے مجلس ان کی صدارت سے محروم ہوگئی ۔ان کے زمانۂ صدارت میں تحریک کشمیر، تحریک کپورتھلہ ، تحریک بہاول پور، تحریک قادیان اور تحریک شہید گنج کو مولانا کی فکری اور عملی رہنمائی حاصل رہی۔ مولانا مجلس احرار کو پورے نظم وضبط کے ساتھ چلاتے رہے اور صوبہ یوپی اور صوبہ سرحد، بہار، بمبئی اور بنگال تک اس کے نظام کو پھیلایا اور منظم کیا۔ اپنے دورصدارت میں ہندوستان کے دیگر سیاسی لیڈروں سے سیاسی امور ومسائل میں ربط وضبط رکھا، جس سے مجلس احرار کے وقار میں اضافہ ہو۔

۱۹۳۱ء میں مجلس احرار اسلام کا صدر بننے کے کچھ دنوں بعد ۳۰/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو احرار نے کشمیر میں حکومت کشمیر کے خلاف تحریک شروع کردی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گاندھی جی اور محمد علی جناح لندن گئے۔ کانفرنس شروع ہونے سے قبل قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے گاندھی جی کے سامنے اپنے مشہور چودہ نکات رکھے، جنھیں گاندھی جی نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ ”میں اپنی ذاتی حیثیت سے ہر چیز منظور کرنے کو تیار ہوں، لیکن کانگریس کی طرف سے کوئی منظوری نہیں دے سکتا“۔ ان حالات کے پیش نظر مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے تحریک کشمیر کے دوران ۱۲/ نومبر کو پریس کو حسب ذیل بیان دیا:

> ”یہ امر واضح ہوچکا ہے کہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے چودہ مطالبات منظور نہیں کیے جائیں گے۔ کیوں کہ حکومت ہند، ہندو اور کانگریس سے خائف ہے...... انگریز سمجھتا ہے کہ ہندو ہمارے نظام حکومت کو درہم برہم کردے گا...... اور مسلمانوں کی نسبت انگریز کے دل میں یقین پیدا ہوگیا ہے کہ ان میں کوئی ایسی سرفروش جماعت نہیں جو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے انگریزی نظام حکومت سے ٹکّر لے ...... یہ خبر اخبارات میں آچکی ہے کہ وائسرائے نے گورنمنٹ برطانیہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی پروا کیے بغیر ہندو لیڈروں سے صلح کرلے...... بنابریں میں ہندوستان کے مسلمانوں کو پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ حالات پر بہادری اور دیانت داری سے غور کریں......“ ۵؎

اس وقت تحریک کشمیر کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے فوراً بعد مولانا کا یہ بیان اخبارات میں شایع ہوا ۔ انہی وجوہ کی بناپر انھیں ۱۲/ نومبر ۱۹۳۱ء کو دفعہ ۱۴۱۔ ۱۴۳۔ اور ۱۰۸/ کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے دفتر (مجلس احرار اسلام کا صدر دفتر) کی تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں کر کے دفتر کو مقفل کر دیا۔ اس مرتبہ مولانا کو نیو سنٹرل جیل ملتان میں رکھا گیا۔ ان کے قیدی ساتھیوں میں اس وقت ہندوستان کی مایہ ناز شخصیات تھیں۔ مثلاً مولانا مظہر علی اظہر، مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری ، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا احمد علی لاہوری ، مولانا قاری عبد الرحمن صاحب نکودری، شیخ حسام الدین امرتسری، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (صدر جمعیۃ علماء ہند) اور مولانا احمد سعید دہلوی (ناظم جمعیۃ علماء ہند) وغیرہ۔ اس مرتبہ مولانا لدھیانوی ۲۲/ فروری ۱۹۳۳ء کو رہا ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں ایک مرتبہ پھر مولانا کو گرفتار کیا گیا۔ اس بار یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے عوام میں تشدد آمیز تقریریں کی ہیں۔ عدالت میں مولانا نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی تردید کی اور ان کا مدلل جواب دیا۔

دوسری جنگ عظیم سے قبل حکومت ہند نے برطانیہ کی امداد کے لیے آرمی بل پاس کیا، جس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ جو بھی فوج میں بھرتی کی مخالفت کرے اسے مجرم سمجھ کر دوسال کی سزا تجویز کی جائے۔ اس بل کی موافقت کرنے والوں میں ہندوستان کے بڑے بڑے رہ نما شامل تھے، لیکن مولانا لدھیانوی نے اس کی پرزور مخالفت کی اور پورے پنجاب میں اس کے خلاف ماحول بنانے کے لیے ہنگامی دورے کیے۔ ان کے ساتھ احرار کارکن بھی اس عمل میں شریک تھے۔ حکومت پنجاب کی اطلاع کے مطابق تقریباً ۲۸۰/ جلسے منعقد کیے گئے۔ حکومت پنجاب (یونینسٹ گورنمنٹ) نے حکومت ہند کے پاس یہ اطلاع دی کہ مولانا حبیب الرحمن اور ان کی جماعت مجلس احرار اس آرمی بل کی مخالفت میں پیش پیش ہے۔ آرمی بل کے خلاف تقریر کرتے ہوئے مولانا نے جو رُخ اختیار کیا، اس سے سرکاری حلقوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی، جس کے نتیجے میں یکم نومبر کو انھیں لدھیانہ سے دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا نے مجلس احرار کی صدارت سے استعفی دے دیا اور سول نافرمانی کے سلسلے میں ہندوستان بھر کے عظیم رہ نماؤں سے ملاقاتیں کیں، جن میں سبھاش چندر بوس، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابو الکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آخر میں مولانا آزاد سے گفتگو میں یہ بات طے پائی کہ یکم جنوری ۱۹۴۱ء تک مولانا آزاد اور گاندھی جی احرار سول نافرمانی کے حق میں اعلان کر دیں گے۔ اس اعلان کے بعد گاندھی جی کے پروگرام کے مطابق احرار رضا کار سول نافرمانی کریں گے۔

تحریک سول نافرمانی کے سلسلے میں مولانا آزاد کے ساتھ مشورہ کے بعد حکومت ہند نے سوچا کہ اگر گاندھی جی کی رہ نمائی میں ہندوستانی مسلمانوں نے سول نافرمانی شروع کر دی تو اس تحریک کو سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا، اس لیے اس نے فوری طور پر اس کے خلاف عملی قدم اٹھایا اور ۱۴ر دسمبر کو مولانا آزاد کو الہ آباد سے اور رفیع احمد قدوائی کو لکھنؤ سے گرفتار کیا۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو مولانا لدھیانوی مولانا عبید اللہ سندی، چودھری افضل اور ڈاکٹر عبد القوی لقمان سے بات چیت میں مشغول تھے کہ پولیس کی ایک لاری آئی اور نظر بندی قانون کے تحت مولانا کو گرفتار کر کے منٹگمری جیل میں قید تنہائی میں بند کر دیا۔ مولانا کی یہ نظر بندی مسلسل پانچ سال تک رہی۔

مولانا لدھیانوی نے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گذار دیا۔ وہ جب آخری مرتبہ ۱۹۴۵ء میں رہا ہو کر آئے تو ہندوستان آزادی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی پاکستان کا قیام بھی ناگزیر ہو چکا تھا۔ مولانا کسی صورت میں بھی ہندوستان کی تقسیم پر تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہندوستان کا بٹوارہ ہوتا ہے تو یہاں کے مسلمان ہر طرح سے کم زور ہو جائیں گے، خاص طور پر پنجاب کا علاقہ، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس سے سب سے زیادہ متاثر ہوگا۔ آزادی کے بعد ہونے والے واقعات نے مولانا کے نظریات کی تصدیق کر دی۔

مولانا لدھیانوی کی دینی، اصلاحی اور ملّی خدمات ہندوستان کی علمی و سیاسی تاریخ کا

ایک سنہرا باب ہے۔ جدو جہد آزادی کے دوران اسلام کے خلاف جو سازشیں ہوئیں، ان کا آپ نے بڑی سختی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آپ کے زمانے کا سب سے اہم مسئلہ قادیانیت کا فتنہ تھا، جس کے ذریعہ انگریز اور دوسرے مخالفین اسلام، اسلام کے مستحکم نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے خاندانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے فتنۂ قادیانیت کا ڈٹ کر مقابلہ کیااورقادیانیوں کی سازش سے عوام کو آگاہ کرایا۔ وہ اپنی پوری زندگی قادیانیت کے خلاف جدوجہد میں لگے رہے، جب بھی ضرورت ہوئی، قادیانی سازش کوعوام کے سامنے بے نقاب کرتے رہے۔ انھوں نے ذاتی طور پر بھی قادیانی پروپیگنڈہ سے لوگوں کودور رکھنے کی کوشش کی اور مجلس احرار کے اہم ارکان کوبھی اس کام پر مامور کیا کہ قادیان جا کر وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کی جائے اوران کے مذہب کی حفاظت کی جائے۔

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان ہجرت کرجانے کا ایک ایساوسیع اور طاقت ور رجحان بلکہ نشہ سب پر چھا گیا، جس کو روکنا اور مسلمانوں کو اس ملک میں مقیم رہنے پر آمادہ کرنا مشکل ہورہا تھا۔ ایسے حالات میں جہاں ہندوستان کے دوسرے علاقے متاثر ہوئے، وہیں مشرقی پنجاب خصوصاً لدھیانہ بھی اس کی زد میں آ گیا۔تقریباً یہی حالات پورے مشرقی پنجاب کے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں کے مسلمان یاتو پاکستان چلے گئے یا جورہ گئے وہ مرتد ہو گئے، مسجدیں سکھوں اور ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئیں اور وقف کی جائدادوں پر بھی دوسروں کا قبضہ ہوگیا۔ ایسے حالات میں اگر پنجاب کے مسلمانوں کی طرف توجہ نہ کی جاتی تو یقیناً پورا مشرقی پنجاب کافر ومرتد ہوکر رہ جاتا اور پنجاب سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ جاتا۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے دہلی میں رہتے ہوئے اس کی طرف توجہ فرمائی اوراس کے لیے باقاعدہ طور پر' انجمن حمایت اسلام' کے نام سے ایک کمیٹی بنائی۔ پنجاب کے مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت، مساجد کو واگذار کرانا، مسلمانوں کو دوبارہ پنجاب میں ان کی حیثیت دلوانا اور آراضیٔ وقف کوغیر مسلموں کے قبضے سے لینااس کے اہم مقاصد تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد مولانا مکمل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔سیاست

سے کنارہ کش ہوکر دینی، اصلاحی اور ملّی خدمات انجام دینے لگے۔آخری دس سالوں میں وہ اکثر وبیش تر مرض میں مبتلا رہے۔آخر کار ۲/ستمبر ۱۹۵۶ء کو یہ آفتابِ حریت ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔آپ کی تدفین دلی جامع مسجد کے ملحقہ قبرستان میں ہوئی۔[۶]

مجلس احرار اسلام کے مقاصد

مولانا لدھیانوی نے جس پلیٹ فارم سے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں نمایاں کارنامہ انجام دیا وہ مجلس احرار ہے۔اس کے قیام کی وجہ بیان کرتے ہوئے جانباز مرزا اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

> ''آخر یہ ہوا کہ ۲۸/دسمبر ۱۹۲۹ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس نے لاہور دریائے راوی کے کنارے اپنے سالانہ اجلاس میں سکھوں کی ناراضگی کا بہانہ تراش کر نہرو رپورٹ کو دریائے راوی کے سپرد کرکے ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزرویشن پاس کرایا۔نہرو رپورٹ کے خاتمے سے ان مسلمانوں کو بے حد صدمہ ہوا جنہوں نے ملت اسلامیہ کی ناراضگی کے باوجود صرف آزادیٔ وطن کے لیے نہرو رپورٹ پر دستخط کیے تھے۔لیکن کانگریس رہ نماؤں نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کرتے وقت ان سے مشورہ لینا بھی مناسب نہ سمجھا اور ایسی بے اعتنائی کا ثبوت دیا کہ بہی خواہان وطن کو کانگریس کی اس بے وفائی پر دلی رنج ہوا۔اسی لمحے ہندوستان کے مسلمان رہ نماؤں نے اپنی الگ تنظیم کا وجود شدت سے محسوس کرتے ہوئے ۲۹/دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کے اسی پنڈال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے پر مجلس احرار کا قیام عمل میں لایا گیا''[۷]

مجلس احرار اسلام کے اغراض ومقاصد یہ تجویز کیے گئے:

الف: پرامن ذرائع سے ہندوستان کے لیے آزادی حاصل کرنا۔

ب: سیاسیات ہند میں مسلمانوں کی صحیح سیاسی راہ نمائی کرنا۔

ج: مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے لیے کوشش کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے درج ذیل ذرائع اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا:

الف: تمام ہندوستان میں مجالس احرار قائم کرنا۔

ب: ہر جگہ جیش مجلس احرار اسلام منظم کرنا۔

ج: مزدوروں اور کاشت کاروں کو اقتصادی اصول پر منظم کرنا۔

د: دیسی صنعتوں کو ترقی کے لیے اور سودیشی اشیاء کی ترویج کے لیے کوشش کرنا۔

ہ: قیام مجلس احرار کے لیے سرمایہ فراہم کرنا اور دیگر ایسے وسائل اختیار کرنا جو وقتاً فوقتاً ضروری خیال کیے جائیں۔ ۸؎

مجلس احرام اسلام کے اغراض ومقاصد کے متعلق ڈاکٹر پی۔این۔چوپڑا تحریر فرماتے ہیں:

> ”مجلس احرار کے اغراض ومقاصد میں ہندوستان کی آزادی، دوسری سیاسی تنظیموں سے اشتراک، مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی پس ماندگی کو دور کرنے کی سعی اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور اسلامی نقطۂ نظر پیدا کرنا شامل تھے“۔ ۹؎

مجلس احرار کی خدمات

مجلس احرار کے ذریعہ جو کارنامے انجام دیے گئے ان میں سب سے اہم تحریک کشمیر اور تحریک ردِّ قادیانیت ہے۔

تحریک کشمیر

کشمیری مسلمان جن حالات سے دوچار تھے اور مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان نے جس طرح ہندوستان کے بااثر حضرات کو اپنی کشمیر کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا، اس سے مولانا لدھیانوی نے محسوس کیا کہ اس طرح کشمیری مسلمانوں کا ایمان ضائع ہونے کا خطرہ ہے، چنانچہ آپ نے بمبئی جاکر مولانا ابوالکلام آزاد سے کشمیری مسلمانوں کے مسئلے اور کشمیر کمیٹی کے فکر وعمل کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا حبیب الرحمن نے بمبئی سے واپسی پر مجلس احرار کے کارکنوں سے صلاح ومشورہ کے بعد اس کے پلیٹ فارم سے تحریک کشمیر کا آغاز کردیا۔ اسی بروقت کوشش کا نتیجہ تھا کہ کشمیر کے لاکھوں مسلمان قادیانی ہونے سے بچ گئے۔ مجلس احرار کے تحریک کشمیر میں حصہ لینے کے نتیجے میں کشمیری مسلمانوں کو درج

ذیل فائدے حاصل ہوئے:

۱۔ وہ کشمیری کاشت کار، جس کے پاس زمین تھی، لیکن وہ اس کا مالک نہیں تھا (کیونکہ ریاست کی تمام اراضی مہاراجہ کی ملکیت تھی) تحریک احرار کے بعد اس کا مالک بن گیا اور ریاست کے مالکانہ حقوق منسوخ ہوگئے۔

۲۔ پچاس فیصد لگان تحریک کے بعد صرف پانچ فیصد رہ گیا۔

۳۔ تقریر وتحریر اور جماعت بنانے کی اجازت مل گئی۔

۴۔ اخبار نکالنے اور آزادیٔ رائے پر کوئی پابندی نہیں رہی۔

۵۔ آزاد اسمبلی کا وجود تسلیم کرلیا گیا۔۱۰؎

مجلس احرار اسلام نے عظیم الشان حق حریت ادا کیا۔اس نے کشمیری تحریک کو آزادی کے قریب پہنچا دیا اور اس میں جان ڈال دی۔ اس تحریک کے دوران تقریباً چونتیس ہزار احرار رضا کار جیل میں ڈالے گئے اور ستائیس شہید ہوئے۔

تحریک ردّ قادیانیت

مرزا بشیر الدین محمود کے دور میں جو لوگ قادیانیت سے تائب ہوکر مسلمان ہوجاتے تھے، قادیانی ان کا سماجی بائیکاٹ کردیا کرتے تھے اور ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھتے تھے۔ قادیان سے باہر کا کوئی مسلمان قادیان جانے میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا تھا۔ ایسے حالات میں وہاں کے مسلمان بہت پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی شخص آئے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرے ۔ چنانچہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کو چنا۔ وہ قادیان، جہاں مسلمانوں کے ایمان سلامت نہ تھے، ان کی عزت وآبرو کو خطرہ لاحق تھا اور ان کا سانس لینا تک دشوار ہورہا تھا، وہاں مولانا مردانہ وار داخل ہوئے اور قادیانیت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

مولانا اپنی پوری زندگی قادیانیت کے خلاف جدو جہد میں لگے رہے، جب بھی ضرورت ہوئی، قادیانی سازش کو عوام کے سامنے بے نقاب کرتے رہے۔ انھوں نے ذاتی طور پر قادیانی پروپیگنڈہ سے لوگوں کو دور رکھنے کی کوشش کی اور مجلس احرار کے اہم ارکان کو بھی اس کام پر مامور کیا کہ قادیان جا کر وہاں کے مسلمانوں کی خدمت اور ان کے

مذہب کی حفاظت کی جائے۔

مولانا لدھیانوی کی جرأت و بے باکی کا اندازہ ان کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ جب احرار تبلیغ کانفرنس ۲۳/ مارچ ۱۹۳۴ء میں شمولیت کے لیے قادیان پہنچے اور وہاں لاکھوں کے مجمع میں جوشیلی تقریر کی تو اپنا اور اپنی جماعت مجلس احرار کے نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

> ''خدا کی قسم! میں اس بات کا منتظر ہوں کہ قادیان کی گلیوں میں احرار رضا کاروں کے خون کی نہریں بہتی ہوں اور میں سمجھ لوں کہ آج میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ اگر میں اپنے مشن کو پورا کرتے ہوئے محمود کے حواریوں کے ہاتھوں خاص قادیان میں قتل کیا جاؤں تو میں اس کو شہادت کبریٰ تصور کروں گا'' ۱۱؎

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی ہونے کی حقیقت اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کے متعلق اپنے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

> ''نبوت کی بحث کس سے کرتے ہو؟ جو سرے سے مرزا (غلام احمد قادیانی) کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔ آؤ تم کو یثربی نبوت کا حال سناؤں کہ ریگستانِ عرب کے لق و دق میں انتہا درجہ کی بے چارگی کے عالم میں علم توحید بلند کرتا ہے۔ اپنے بیگانے دشمن ہوگئے، قتل کے منصوبے کیے گئے اور وطن سے نکلنا پڑا۔ بتلاؤ کسی حکومت سے امداد کی درخواست کی کہ مجھے کفار مکہ سے بچاؤ۔...... یہ ہے شان نبوت۔ تم ہی بتلاؤ کہ قادیان کی نوزائیدہ نبوت پولیس کے بغیر کبھی دو قدم بھی باہر چلی ہے۔ ساری عمر کی قید نہیں، ایک دن بتلا دو کہ فلاں دن قادیان کی نبوت پولیس سے بے نیاز تھی۔ پس یہ نبوت تو پولیس کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے نبی بنا دے۔ پس جس شخص کا کسی پولیس افسر سے دوستانہ ہو نبوت کا دعویٰ کردیا کرے۔ یاد رکھو کہ نبی جب کم زور ہوتا ہے تو وہ اپنی بہادری اور شجاعت کا عظیم الشان مظاہرہ دنیا کے سامنے کرتا ہے اور دنیا کی تمام طاغوتی اور مادی قومیں سرنگوں ہوجاتی ہیں اور جب وہ طاقت ور ہوجاتا ہے تو دشمنوں تک کے لیے رحیم ہوجاتا ہے'' ۱۲؎

مولانا موصوف کے اندر قادیانیوں کے خلاف عملی جدوجہد کا زبردست جذبہ پایا جاتا تھا۔ اسی جذبہ کے تحت وہ اپنی تقاریر میں برابر احرار رضا کاروں کو دشمنوں سے بے خوف ہوکر عملی جدوجہد کرنے کی تلقین کرتے رہے اور خود بھی تا زندگی اس پر عمل پیرا رہے۔

تحریک شاتم رسولؐ

۱۹۲۷ء کے وسط میں لاہور کے ایک ہندو ناشر 'راج پال' نے پنڈت چرم پتی ایم،اے کی چونسٹھ (۶۴) صفحات پر مشتمل کتاب 'رنگیلا رسول' نام سے شایع کی۔ اس میں حضورؐ کے دامن اطہر پر گندے چھینٹے ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ دیکھ کر مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ کا دل بے قرار ہوگیا۔ چنانچہ آپ نے پنجاب میں اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور پرجوش تقریریں کیں۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں خاص طور پر مسلمانوں سے کہا کہ:

> ''یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کرنے والے کی زبان نہ رہے یا سننے والے کے کان نہ رہیں'' ۱۳؎

مذکورہ بالا تقریر کی بنا پر انگریز حکومت نے آپ کو مجرم ٹھہرایا اور ۱۰؍جولائی کو دفعہ ۱۰۷ کے تحت لدھیانہ سے گرفتار کرلیا۔ حکومت نے عدالت میں مقدمہ چلایا اور ضمانت طلب کی کہ آئندہ اس طرح کی بات نہیں کہیں گے۔ لیکن مولانا نے ضمانت دینے سے انکار کردیا، جس کی وجہ سے آپ کو ایک سال قید کی سزا دی گئی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ۱۹۵۵ء کے اخیر میں پیش آیا کہ کسی شخص نے حضورؐ کے اسم مبارک کو توہین آمیز طریقے سے استعمال کیا۔ اخبارات کے ذریعہ یہ خبر پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ جب مولانا حبیب الرحمن کی نظر سے یہ خبر گذری تو وہ مضطرب ہوگئے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے، جن سے بانیان مذاہب کی توہین کی جاتی ہو تو اس سے ملک کا امن وسکون برباد ہوکر رہ جائے گا اور پوری دنیا میں ہندوستان کے باشندے ذلیل ورسوا ہوں گے۔ اپنے تاثر کا اظہار انھوں

نے ایک مضمون میں کہا، جس میں تحریر فرمایا:

''کیا ہماری بڑی کوتاہی اور جرم نہیں ہے کہ ہم نے اپنے ہمسایہ قوم کو ایک ہزار سال میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت سے متعارف نہیں کرایا۔ ہم ہر سال کروڑوں روپیہ مولود خوانی اور سیرت النبی کے جلسوں پر تو خرچ کرتے ہیں، لیکن اپنے کروڑوں ہم وطنوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت و شخصیت کے تعارف سے محروم رکھتے ہیں۔ ہم سب کو خدا کے سامنے اپنی اس غفلت کا جواب دینا ہوگا جو ہم نے ہم وطنوں سے برتی ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں جب کبھی متعصب سے متعصب غیر مسلم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت اور سیرت کا تعارف کرایا تو وہ رونے لگا اور ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ: کاش! حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپؐ کی زندگی کے حالات تمام دنیا کو اس طرح بتائے جائیں، جس طرح کہ آپ نے ہم کو بتائے ہیں''۔ ۱۴؎

ردِّ قادیانیت میں احرار کی خدمات

فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی میں مولانا حبیب الرحمن کے خاندان کے بزرگوں نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مرزا غلام احمد (پیدائش ۱۸۳۹/ ۱۹۰۸ئ) نے ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء میں مجدد ہونے کا دعویٰ کیا تو مولانا کے دادا مولانا محمد اور ان کے دو بھائیوں (مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالعزیز) نے مرزا سے ملاقات اور گفتگو کے بعد اس کے کافر ہونے کا فتویٰ دیا۔ بعد میں اس کی کتاب 'براہین احمدیہ' دیکھنے کے بعد اس کفر کی تصدیق ہوگئی۔ علماء دیو بند کی ایک مجلس ہوئی، جس میں مولانا محمد لدھیانوی اور ان کے برادران کی تحقیقات پر علماء دیو بند نے رضامندی کے دستخط ثبت کیے اور مرزا کے کافر و مرتد ہونے کی تصدیق کردی۔ بعد میں رفتہ رفتہ دیگر اہل علم نے بھی مرزا قادیانی کے ضال و مضلّ ہونے پر اتفاق کیا، حتیٰ کہ علماء حرمین نے بھی اس کے دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ تحریر کیا۔ ۱۵؎

برصغیر میں ردِّ قادیانیت کے میدان میں جو جماعتیں سرگرم ہوئیں اور انھوں نے باقاعدہ اپنے رضا کاروں میں زبردست ولولہ اور جوش بھر دیا، ان میں سب سے اہم مجلس احرار تھی۔ اس میں مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے رہ نما شامل تھے۔ مولانا

حبیب الرحمن لدھیانوی اس کے روح رواں، امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے دست و بازو اور چودھری افضل حق اس کا دماغ تھے۔ اس کے بقیہ ممبران میں بڑے ذی استعداد علمائ، وکلائ، شعرائ، ادباء اور خطباء تھے، جن میں تقویٰ، پرہیزگاری، علم و عمل، دین داری اور تدبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

مجلس احرار نے فرقۂ قادیانیت کے متعلق ایسی واضح اور دوٹوک پالیسی اختیار کی جیسی آج تک کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت اختیار نہیں کر پائی۔ اس نے قادیانیوں کا پنجاب، بلوچستان اور بتدریج پاکستان میں قادیانی اسٹیٹ قائم کرنے کا منصوبہ جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا گیا، ان کے عزائم مشئومہ سے امت مسلمہ کو باخبر رکھا، حکومت اور اعیان حکومت کو ان کی سرگرمیوں سے مطلع کیا اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے قیام میں سرگرم کردار انجام دیا، جس کے تحت اردو، عربی، فارسی، انگریزی، ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں وافر مقدار میں کتب و رسائل اور پوسٹر شایع کروایے۔ ختم نبوت کے متعلق جو خدمات احرار نے انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ خاص طور سے پاکستان میں ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کا پردہ چاک کرکے اور اس کے خلاف ایک زبردست تحریک شروع کرکے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ احرار ہی کا حصہ ہے۔

احرار کانفرنس

قادیان میں مرزائیوں نے اپنی اکثریت کے زعم میں ظلم و قہر برپا کر رکھا تھا۔ وہ غیر مرزائی آبادی کو پریشان و حراساں کرتے تھے۔ انگریز حکومت کی موجودگی میں خلیفہ قادیان کا گھریلو آئین جاری تھا، دن کی روشنی میں مخالفوں کا قتل عام، مسلمانوں کا اقتصادی مقاطعہ، عصمتوں کی پامالی اور قصر خلافت میں اخلاق سوز حرکات کا صدور ہوتا تھا۔ ان جرائم سے حکومت بھی پریشان تھی، لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتی تھی، کیوں کہ یہ انہی کا لگایا ہوا پودا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر مجلس احرار نے عملی اقدام کرتے ہوئے قادیان میں اپنا ایک دفتر کھولا اور قادیانیت کے خلاف اسی کے گھر سے آواز بلند کی۔ کچھ ہی دنوں بعد مجلس احرار نے دوسرا عملی قدم اٹھاتے ہوئے خاص قادیان میں ردِّ قادیانیت کانفرنس کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس پر قادیانیوں نے انگریزی حکومت

سے درخواست کی کہ احراری ہم پر حملہ کرنے آ رہے ہیں، انہیں روکا جائے۔ اس کانفرنس میں احرار کے ممبران بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ احرار اسپیشل ٹرین، جو چالیس ڈبوں پر مشتمل تھی، امرتسر سے قادیان کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کے دونوں طرف احرار کے سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ اس کانفرنس میں احراری رہ نماؤں کے علاوہ دیگر قدآور شخصیات میں مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مفتی ابوالوفا شاہ جہاں پوری اور مولانا احمد علی لاہوری وغیرہ تھے۔ کانفرنس مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی صدارت میں شروع ہوئی۔ ان کے علاوہ اس موقع پر دیگر علماء کرام کی تقریریں ہوئیں۔ آخری اجلاس میں حسب ذیل قراردادیں منظور ہوئیں:

(۱) تمام دنیائے اسلام کے علماء مرزا کو اس کے دعوائے نبوت اور دیگر دعاوی وعقائد کفریہ کی بنا پر اسلام سے خارج اور مرتد سمجھتے ہیں، اس لیے کانفرنس حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ تمام مرزائیوں کو مردم شماری میں مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے۔

(۲) مسلمانان ہند کا یہ اجتماع اپنے عزم بالجزم کا اعلان کرتا ہے کہ جب تک حکومت چودھری ظفر اللہ خاں کی تقرری کو منسوخ کر کے اپنی قادیانیت نواز پالیسی میں تبدیلی نہیں کرتی، مسلمانان ہند اپنے احتجاج کے سلسلہ کو جاری رکھیں گے۔

بہر حال عقیدۂ ختم نبوت کی حفاظت کے لیے قادیانی حصار کو توڑنا بہت ضروری تھا۔ برطانوی پناہ میں ہونے کی وجہ سے اس میں دراڑ ڈالنا بہت دشوار تھا۔ احرار نے ہر رخ سے اس پر یلغار کی اور اس کی سرکوبی میں کام یابی حاصل کی۔

قادیانوں کی طرف سے دعوت مباہلہ کا جواب

مرزا بشیر الدین محمود نے مجلس احرار کو دعوت دی کہ آؤ قادیان اور مباہلہ کیا جائے۔ مجلس احرار نے اس دعوت کو فوراً قبول کیا اور ۱۳؍ ستمبر کو قادیان پہنچنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا شایع ہونا تھا کہ قادیانیوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ کہنے لگے کہ احرار والے قادیان میں پھر فساد کرنے آ رہے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ احراری تحریکِ شہید گنج میں الجھے ہوئے ہیں، وہ ہمارے چیلنج کو قبول نہیں کریں گے۔ لیکن جب احرار نے ان کے چیلنج کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا تو مرزائی پریشان ہوئے۔ مجلس احرار نے

مولانا مظہر علی اظہر کو مباہلہ کے لیے نامزد کیا۔ تاریخ مقررہ پر احراری رہنما قادیان پہنچے اور ان کی تقریریں ہوئیں۔ مولانا مظہر علی اظہر نے اپنی تقریر میں مرزائیوں کو دعوت مباہلہ دیتے ہوئے فرمایا:

"یہ بات احرار کے حصے میں آئی ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پرانے عیسائیوں کو آیتِ مباہلہ کے ذریعہ مباہلہ کا چیلنج دیا تھا اسی طرح ہم بھی آج ان نئے مسیحوں یعنی قادیانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ مباہلہ کے بارے میں حکم قرآنی یہ ہے کہ آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں، تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر ہم مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم میں سے جس کو زیادہ سے زیادہ بدعقیدہ یا بدعمل، خائن یا غدار سمجھے اس کو مباہلہ کے لیے بلالے، وہ شیعہ ہو یا سنّی، بریلوی ہو یا دیوبندی، حنفی ہو یا اہل حدیث، وہ اسی طرح اپنے خاندان کو میدانِ مباہلہ میں لے کر نکلے گا جس طرح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امام حسینؓ کو گود میں لیے ہوئے اور حضرت حسنؓ کو انگلی سے لگائے ہوئے اور جناب فاطمہ الزہرہؓ اور حضرت علیؓ شیر خدا کو پیچھے پیچھے ہم راہ لیے ہوئے وفد بنونجار کے مقابلہ میں مباہلہ کے لیے نکلے تھے"۔[۱۶]

مسلم انجمنوں سے مرزائیوں کے اخراج کا مطالبہ

۳۱/جنوری ۱۹۳۵ء کو مجلس احرار کی طرف سے ہندوستان بھر کی مسلم انجمنوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے اداروں سے مرزائیوں کو خارج کردیں۔ اس کی سب سے زیادہ زد لاہور کی انجمن حمایت اسلام پر پڑرہی تھی۔ علامہ اقبال کے مستعفی ہونے کے باوجود مرزائی اس کے ممبر بنے رہے اور یہ انجمن ان کو اپنے سے علیحدہ نہ کرسکی۔ چنانچہ مجلس احرار نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر عوام کی جانب سے ایک قرارداد پیش کی کہ مرزائیوں کو اب تک انجمن سے خارج نہیں کیا گیا ہے۔ چوں کہ تمام علمائے اسلام کے نزدیک یہ غیر مسلم ہیں اور غیر مسلم انجمن حمایت اسلام کا ممبر نہیں ہوسکتا، اس لیے انھیں انجمن کی

ممبرشپ سے خارج کیا جائے۔ اس قرارداد پر بہت ہنگامہ ہوا، پھر بھی اسے اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔ ۱۷؎

شعبۂ تبلیغ کا قیام

مجلس احرار نے ہندوستانی عوام اور خاص طور پر قادیان میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات اور ان کے لیے تبلیغ اسلام کی ضرورت واہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے شعبۂ تبلیغ کی بنیاد ڈالی اور اس ضمن میں تین شعبے قائم کیے:

(۱)شعبۂ تبلیغ ،(۲)شعبۂ اصلاح تنظیم ،(۳)شعبۂ خدام خلق

یہ شعبے ملازم پیشہ مسلمانوں کی اس بنیادی کم زوری کو بھانپتے ہوئے قائم کیے گئے تھے کہ وہ مجلس احرار کے ساتھ سرگرم تعاون نہیں کر سکتے، اس لیے وہ اس شعبہ میں کام کریں، جس سے ان کی سرکاری ذمہ داریاں بھی مجروح نہ ہوں اور دین کا کام بھی ہوتا رہے۔ اس شعبہ کے اغراض ومقاصد یہ طے پائے:

۱۔ ہندوستان میں اور بیرون ہند میں اسلام کے مقدس اصولوں کی اشاعت کرنا۔

۲۔ مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا جذبۂ صادق پیدا کرنا اور مبلغین اسلام کی ایک سرگرم ٹیم تیار کرنا۔

۳۔ فتنۂ قادیان کے تباہ کن اثرات سے تعلیم اسلامی کو محفوظ رکھنا اور مسلمانوں کو ان کے دجل سے بچانا۔

۴۔ خدمت خلق اور اسلامی اخلاق کی عملی کیفیت پیدا کرنا۔

۵۔ یہ شعبہ خالص دینی اور مذہبی ہوگا۔ سیاسیات ملکی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ۱۸؎

قادیان میں احرار کا دفتر قائم ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس جگہ مدرسہ جامعہ محمدیہ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ شعبۂ تبلیغ کے قیام نے مرزائیوں میں ہیجان اور مسلمانوں میں تبلیغ دین کی ایک نئی روح پھونک دی ۔ اس شعبہ نے سب سے پہلے مبلغین اسلام کی ایک سرگرم جماعت تیار کی، جس نے اپنے فرائض بہ خوبی ادا کیے ۔ مولانا لال حسین اختر کو اس شعبہ کا پہلا نگراں مقرر کیا گیا، جنہوں نے ہند و بیرون ہند کے دورے کر کے شعبہ کے مقاصد پورے کیے۔

مسلمانوں کے قبرستان میں مرزائیوں کی تدفین پر روک

مجلس احرار کے نزدیک چوں کہ مرزائی غیر مسلم تھے، اس لیے ان کا ہر قسم کا مقاطعہ اہم اور ضروری تھا۔ قومی اور ملکی معاملات کے علاوہ موت وحیات کے سلسلے میں بھی احرار کا موقف تھا کہ کسی مرزائی کی لاش مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونی چاہیے۔ آخر ۱۹؍جولائی ۱۹۳۵ء کوامرتسر کے ایک قبرستان میں ایک مرزائی کو دفن کرنے پر ہنگامہ ہوا۔ پولیس نے اس موقع پر مداخلت کی۔ احرار رضا کاروں پر لاٹھیاں چارج ہوئیں اور ان کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ بالآخر اس مرزائی کی لاش ایک دوسرے قبرستان میں دفن کی گئی، جس میں امتیاز مذہب کے بغیر بچوں کو دفن کیا جاتا تھا۔

اچھوت تبلیغ کانفرنس

آل انڈیا احرار پولیٹکل کانفرنس امیر شریعت کی صدارت میں شروع ہوئی، جس میں خطبۂ صدارت سنانے کے بعد شاہ جی (مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) نے فرمایا:

> ’’اس وقت ہمارے سامنے تین مسئلے سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہیں۔ پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے۔ دوسرا ختم نبوت کا ہے۔۔۔۔ تیسرا مسئلہ جو سب سے زیادہ اہم ہے، وہ پولیٹیکل اچھوت کا ہے۔ وہ ہندوؤں سے بخوبی واقف ہے۔۔۔۔ اگر ان کو مساوات اور انسانیت کا درجہ کسی مذہب میں حاصل ہوسکتا ہے تو وہ مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اچھوت کو اپنے میں جذب نہیں کرسکتا۔ اسلام نے مذہب کے معاملے میں بھی جبر واکراہ سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے عمل سے تلقین کی کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے جو مسلمان نہیں...... ہمارا فرض ہے کہ اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کے ذریعہ اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہے...... کوئی تلوار کارگر نہیں ہوتی، بلکہ اخلاق کی تلوار ہمیشہ کے لیے انسان کو رام کرلیتی ہے، اس لیے اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملانے اور دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا ایک طریقہ ہے کہ تم اس خُلق عظیم کو اختیار کرلو جو اسلام نے ہمیں بخشا ہے‘‘۔۱۹؎

مجلس احرار اسلام نے دینی، تعلیمی، تبلیغی اور سیاسی کوششوں کے لیے مختلف دفاتر کھولے، مختلف کانفرنسیں کیں، تاکہ ان دفاتر سے ایک ہی کام لیا جائے اور وہ ہے قادیانیت کی بیخ کنی اور مسلمانوں کے اندر صحیح اسلامی تبلیغ۔ مجلس احرار اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہی اور احراریوں کی یہ کوشش تقسیم ہند کے بعد آج تک جاری ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ مولانا عبدالقادر لدھیانویؒ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد اور سید احمد شہیدؒ کے ہم درس تھے۔ وہ پنجاب کے تنہا بزرگ تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں لدھیانہ میں انگریزی سامراج کے خلاف فتویٰ دیا اور انگریزی حکم رانوں سے باقاعدہ جنگ کر کے متوازی گورنمنٹ قائم کی۔ ان کا انتقال ۱۸۶۰ء، موضع ستلانہ (اصل نام ست رانا) پٹیالہ میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ (رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیز الرحمن جامعی، اعلیٰ پریس دہلی، ۱۹۶۱ئ، ص ۶۳۔ ۶۲

۲۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی۔ ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، اشتیاق پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۰۱ئ، ص ۱۳۰

۳۔ رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، ص ۱۰۳

۴۔ کاروانِ احرار، جانباز مرزا، تجارت پرنٹرز، لاہور، ۱۹۷۵ئ، ج ۱، ص ۱۳۴

۵۔ حوالہ سابق، ج ۱، ص ۲۱۹

۶۔ درحدیث دیگراں، عزیز الرحمن جامعی، جمال پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۷۵ئ، ص ۱۶۸

۷۔ کاروانِ احرار، ج ۱، ص ۸۲

۸۔ مجلس احرار اسلام کی ضرورت واہمیت، محمود علی خاں کیلاش پوری، ہمدرد پریس، سہارن پور، سن غیر مذکور، ص ۹

۹۔ انڈیاز اسٹریگل فار فریڈم: رول آف ایسوسی ایٹڈ مومنٹس، ڈاکٹر پی این چوپڑا، ج ۲، آگھم پرکاش، ۱۹۸۵ئ، ص ۳۴۸ ۱۰۔ کاروانِ احرار، ج ۱، ص ۲۷۷

۱۱۔ سب سے پہلا فتوائے تکفیر، حبیب الرحمن لدھیانوی، کتب خانہ اختری، سہارنپور، یوپی، ۱۹۹۸ئ، ص ۲۳۵

۱۲۔ حوالہ سابق، ص ۳۳۶ ۱۳۔ حوالہ سابق، ص ۲۳۴

۱۴۔ مضامین رئیس الاحرار، محمد احمد رحمانی، حبیب روڈ لدھیانہ، ۱۹۶۷ئ، ص ۱۰

۱۵۔ سب سے پہلا فتوائے تکفیر، ص ۳۰۱ ۱۶۔ کاروانِ احرار، ج ۲، ص ۲۶۹

۱۷۔ حوالہ سابق، ج ۲، ص ۳۲۹ ۱۸۔ مجلس احرار اسلام کی ضرورت واہمیت، ص ۱۶

۱۹۔ کاروانِ احرار، ج ۲، ص ۴۴۴

☆☆☆

ترجمہ و تلخیص

امام راغب اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کے اصول تاویل کا تقابلی مطالعہ

——————— ڈاکٹر محمد یوسف الشربجی

مترجم: مولانا ابوسعد اعظمی

تاویل کا شمار ان اہم ترین موضوعات میں ہوتا ہے جن میں شروع سے ہی علماء کے دو گروہ رہے ہیں۔ بعض تاویل کے حق میں ہیں اور بعض اس کے مخالف۔ تاویل کا دائرہ بہت بڑا اور شاخ در شاخ ہے۔ اس مقالہ میں امام راغب اصفہانیؒ اور مولانا عبدالحمید فراہیؒ کے بیان کردہ اصول تاویل کا تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ نے اپنے مقدمۂ تفسیر کی ایک فصل 'التفسیر والتاویل' میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ان کے بعد کے علماء مثلاً نجم الدین الطوفیؒ، بدرالدین الزرکشیؒ اور جلال الدین سیوطیؒ وغیرہ نے تاویل کے باب میں ان کی بیان کردہ اسی تفصیل پر اعتماد کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'التکمیل فی اصول التاویل' میں اس کو موضوع بحث بنایا ہے۔

تاویل وتفسیر کے موضوع پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، لیکن کسی شخص نے بحث وتحقیق کی روشنی میں ائمۂ تفسیر کے درمیان اس طرح کا تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بالخصوص مذکورہ دونوں اماموں کے درمیان، جنہیں اپنے اپنے دور میں قرآن کے ترجمان کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ امام اصفہانی کو علوم وفنون کی تحصیل کے بعد اہل زمانہ کے درمیان کافی شہرت و پذیرائی ملی اور تفسیر اور غریب القرآن کے موضوع پر ان کی تصانیف کو مرجع اساسی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے برعکس مولانا فراہی عرصۂ دراز تک علمی وثقافتی حلقوں، بالخصوص عالم عرب میں غیر معروف اور گم نام

رہے۔ تفسیر اور علوم القرآن کے بہت سے مسائل میں اساس فراہم کرنے والے اس ہندوستانی عالم کو وہ شہرت نہیں مل سکی جس کے اصلاً وہ حق دار تھے۔ درحقیقت وہ نظریۂ نظم قرآن کے علم بردار تھے۔ اسی کی بنیاد پر انہوں نے اپنی تفسیر کا نام 'نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان' رکھا۔ ان کے تعارف کے لیے ان کا صرف یہی ایک کارنامہ کافی ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کا اجمالی تعارف

امام اصفہانیؒ کا پورا نام حسین بن محمد المفضل ابوالقاسم الراغب اصفہانی ہے۔ اصفہان کی طرف نسبت کی وجہ سے اصفہانی کہلائے۔ آپ کی جائے پیدائش اور تاریخ ولادت کے سلسلے میں قدیم مراجع خاموش ہیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ آپ کا تعلق اصفہان سے ہے اور بغداد میں آپ نے سکونت اختیار کی۔ آپ کے علم وفضل اور حکمت ودانائی پر علماء کا اتفاق رہا ہے۔ آپ کے مسلک کے بارے میں متعدد آراء ہیں۔ بعض نے آپ کو معتزلی اور شیعہ قرار دیا تو کچھ نے آپ کو اشعری کہا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آپ سنّی المسلک تھے۔ آپ نے وسعت مطالعہ، باریک بینی، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور وجوہ اختلاف پر عمیق نظر رکھنے اور متضاد اقوال میں تطبیق کی صلاحیت ہونے کی وجہ سے کوئی متعین مسلک اختیار نہیں کیا۔ آپ نے متعدد تصانیف کا قابل قدر ذخیرہ چھوڑا ہے، جو آپ کے وسعت علم وفضل کا بیّن ثبوت ہے۔ آپ کی چند اہم تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ المفردات فی غریب القرآن

۲۔ الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ

۳۔ محاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء

۴۔ تفصیل النشأتین وتحصیل السعادتین

۵۔ جامع التفاسیر

اس کے علاوہ درج ذیل مخطوطات بھی آپ کے علمی سرمایہ کے طور پر موجود ہیں:

(۱) تحقیق البیان فی اللغۃ والحکمۃ

(۲) افانین البلاغۃ

(۳) رسالۃ منبّھۃ علی فوائد القرآن

(۴) تحقیق الألفاظ المترادفة علی المعنی الواحد
(۵) کتاب الحکمة
(۶) کتاب الإیمان والکفر [۱]

امام فراہیؒ کا پورا نام عبدالحمید بن عبدالکریم فراہی ہے۔ ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء میں صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاوں 'پھریہا' میں آپ کی ولادت ہوئی۔ قرآن کریم سے شیفتگی اور عربی زبان سے والہانہ عقیدت آپ کے خمیر میں شامل تھی۔ آپ کو علامہ شبلیؒ نعمانی سے شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے۔ طلب علم کے لیے لکھنو، سہارنپور اور علی گڑھ کا سفر کیا۔ عربی زبان میں درک حاصل کرنے کے ساتھ کثرت سے جاہلی اشعار حفظ کیے۔ اپنے زمانے کی متداول زبانیں مثلاً فارسی، انگریزی اور عبرانی میں بھی مہارت پیدا کی۔ قرآن کریم میں غور وفکر کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ ۱۹۳۰ء میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔ آپ نے تصنیف وتالیف کی صورت میں گراں قدر تحریری سرمایہ چھوڑا ہے، جن میں سے اکثر عربی زبان میں ہیں۔

تاویل وتفسیر پر اصفہانی وفراہی کے مباحث

امام اصفہانیؒ نے اپنی تفسیر المسمّٰی 'جامع التفاسیر' کے شروع میں ایک مختصر مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اس میں اپنا منہجِ تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس سے مقصود قرآن کریم کی تفسیر وتاویل کے ان اہم ترین نکات کی وضاحت ہے جو صحابۂ کرام، تابعین اور سلف صالحین سے منقول ہیں۔ ہم اس میں سے وہ چیز پیش کریں گے جس سے اس کے اسرار ورموز واضح ہو جائیں گے اور دل کو سکون وقرار حاصل ہوگا''۔ یہ مقدمہ تیئس (۲۳) فصلوں پر مشتمل ہے۔

مولانا فراہیؒ کی کتاب 'التکمیل فی اصول التاویل' کا تعارف کراتے ہوئے مولانا بدرالدین اصلاحیؒ نے لکھا ہے کہ ''امام فراہی کی اس کتاب میں ان بنیادی اصولوں کا تذکرہ ہے جن کی مدد سے قرآن کریم کی صحیح تاویل کی جاسکتی ہے۔ اس کا موضوع مفہوم پر دلالت کے لحاظ سے کلمہ اور کلام ہیں اور اس کا مقصد کلام کا فہم اور معنیٔ مراد کی ایسی تاویل ہے کہ

سارے احتمالات رفع ہو جائیں۔ ہر کلام میں تاویل کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور ان کا نفع عام ہوتا ہے۔ان کا تعلق کسی بھی زبان کے معنیٔ کلام کی قسم سے ہوتا ہے، لیکن اس کا سب سے بڑا فائدہ کتاب اللہ کا فہم اور اس کے محاسن کی معرفت ہے، تاکہ اس پر مضبوطی سے قائم رہا جاسکے۔'' 'التکمیل فی اصول التاویل' کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جب مولانا فراہیؒ نے دیکھا کہ فہم قرآن کے باب میں علماء میں زبردست اختلاف ہے اور اس کی تاویل میں انھوں نے مختلف مذاہب اختیار کر رکھے ہیں تو ان کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ صرف اور صرف اس وجہ سے ہے کہ تاویل کے عام اصول وضع نہیں ہوسکے ہیں، جن پر قرآن سے استنباط کرنے والا ہر شخص اعتماد کرسکے۔اگر ان کے پاس تاویل کے عام اصول ہوتے تو ان کا اس کے باب میں اختلاف نہ ہوتا اور جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ ہرگز نہ کہتے۔چنانچہ انھوں نے اس فن کی تاسیس کی شدت سے ضرورت محسوس کی اور اس باب میں سعی و جہد کے ذریعہ توفیق الٰہی سے اس فن کو راسخ اور مستحکم اصولوں پر قائم کردیا۔اس کی بنیاد زبان اور اسالیب قرآن کے ان قواعد پر رکھی، جو راہ راست کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں، معنیٔ مراد کے فہم میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں، تاویل میں کج روی سے بچاتے ہیں، تفسیر بالرای سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان تمام چیزوں کے لیے معیار اور کسوٹی فراہم کرتے ہیں جو قرآن سے ماخوذ ہیں''۲؎۔

مولانا فراہیؒ کی کتاب التکمیل کی حیثیت امام اصفہانی کے مقدمۂ تفسیر کی سی ہے۔یہ ان کی تفسیر 'نظام القرآن' کا مقدمہ ہے۔مولانا کے مطابق اس کتاب کا مقصد ''ان اصولوں کی معرفت ہے جو ذہن انسانی کے مطابق فہم قرآن میں معاون و مددگار ثابت ہوسکیں۔ان اصولوں کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ اصول جن سے تاویل کے باب میں کج روی سے محفوظ رہا جاسکے۔(۲) وہ اصول جو کتاب اللہ میں شامل حکمتوں کی طرف رہ نمائی کرسکیں اور ان کا بنیادی مقصد نظم قرآن میں غور کرنا ہے۔اس لیے کہ نظم ہی وہ مضبوط رسی ہے جس کی مدد سے کج روی سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔۳؎

مولانا فراہی کی یہ اہم تصنیف پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔اس میں آپ نے جابجا

بیاض چھوڑ رکھی ہے۔ آپ ہمیشہ فکر کو اس کا صحیح حق دینے کے خواہش مند رہے، یہاں تک کہ جب کسی بحث کی تمام راہیں استوار ہو جاتیں تو جو کچھ آپ کے ذہن میں اس فن سے متعلق ہوتا اسے صفحۂ قرطاس پر لے آتے۔ اسی وجہ سے ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والوں کو جا بجا بکھرے ہوئے نوادرات ملتے ہیں، جنھیں ان کے شاگردوں نے ان کی وفات کے بعد جمع کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے شاگرد نے حاشیہ میں 'افاداتِ فراہی' کے عنوان سے تاویل قرآن کے بعض اصولوں کا تذکرہ کیا ہے، جو یہ ہیں:

(۱) قرآن کریم کی آیات میں کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا ہے، لہٰذا اس کی وہی تاویل کرنی چاہئے جو نظم کے خلاف نہ ہو۔

(۲) متشابہ کو محکم کی طرف لوٹانے کے سلسلے میں قرآن کی تصریحات موجود ہیں۔ پس اس سے جو چیز یقینی طور پر معلوم ہو اسے امر محکم قرار دیا جائے گا۔

(۳) ہم اپنے اصول قرآن اور عقل سے اخذ کریں گے۔

(۴) قرآن کو اس کے ظاہر سے ہٹانے کے معاملے میں ہم کسی کم زور دلیل پر اعتماد نہیں کریں گے۔ ہم ظاہر کو حجت قرار دیں گے۔

(۵) احتمالات کی صورت میں ہم نظم اور عمود کے موافق اور صحیح ترین تاویل اختیار کریں گے۔[۴]

اصول تاویل کے باب میں مولانا فراہی کی آراء کا خلاصہ یہی ہے۔ اسے آپ کے شاگرد نے سرسری طور پر افادات کی شکل میں حواشی میں جمع کر دیا ہے۔ پوری کتاب انہی اصولوں پر گردش کرتی ہے۔

دونوں کتابوں کے اجمالی تعارف کے بعد اب ان دونوں امامانِ فن میں سے ہر ایک کے نزدیک اصول تاویل کیا ہیں؟ اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

امام راغب اصفہانیؒ کے اصول تاویل

امام اصفہانیؒ نے اپنے مقدمہ تفسیر میں تفسیر و تاویل کے درمیان فرق کے لیے قائم کردہ فصل میں تاویل کی دو قسمیں بیان کرنے کے بعد چند اصول تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تاویل کی دو قسمیں ہیں: (۱) مستنکرہ (ناموزوں) (۲) منقاد (موزوں)۔

مستنکرہ وہ تاویل ہے کہ دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ناگواری کا احساس ہو اور جھوٹی تدلیسات کی وجہ سے قباحت محسوس ہونے لگے۔ اس کی چار قسمیں ہیں:

(۱) لفظ عام ہو لیکن اسے اس کے مشمولات میں سے کسی کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔ مثلاً آیت کریمہ **وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ** (التحریم: ۴) کو بعض لوگوں نے صرف علی بن ابی طالبؓ پر محمول کیا ہے۔

(۲) دو چیزوں کے درمیان باطل کی آمیزش کر دی جائے۔ مثلاً ان لوگوں کا قول جو اس بات کے قائل ہیں کہ سارے حیوانات بھی مکلف ہیں۔ دلیل کے طور پر وہ درج ذیل آیات کریمہ پیش کرتے ہیں:

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر: ۲۴) **وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم** (الانعام: ۳۸)

(۳) جس میں کوئی جھوٹی یا جھوٹ سے ملتی جلتی خبر پیش کی جائے۔ مثلاً آیت کریمہ **يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ** (القلم: ۴۲) میں ایک موضوع حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بعض افراد نے 'جارحۃ' مراد لیا ہے۔ ۵ے

(۴) جس میں استعارات اور دور دراز کے مشتقات سے مدد چاہی جائے۔ جیسا کہ بعض افراد نے 'بقر' کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے مقصود ایسا انسان ہے، جو علوم کے اسرار و رموز کھولتا ہو اور 'ہدہد' کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایسا انسان ہے جو بحث و تحقیق کے وصف سے متصف ہو۔

پہلی قسم کا نقص عموماً ان فقہاء کے یہاں نظر آتا ہے جنہیں خاص وعام کے پرکھنے کا درک نہیں ہے۔ دوسری قسم کا نقص اس متکلم کو پیش آتا ہے جو نظم کی شرائط سے اچھی واقفیت نہیں رکھتا۔ تیسری قسم کے نقص کا شکار وہ محدث ہوتا ہے جسے قبولِ احادیث کی شرائط کا صحیح فہم نہیں ہوتا۔ چوتھی قسم کا نقص اس ادیب کو پیش آتا ہے جو استعارات و اشتقاقات کی شرائط سے غافل ہوتا ہے۔

اس کے بعد امام اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ 'موزوں تاویل وہ ہے جس میں مندرجہ

بالا نقائص راہ نہ پاتے ہوں، البتہ راسخین فی العلم کے درمیان اس کے سلسلے میں تین صورتوں میں اختلاف پیش آسکتا ہے:

(۱) لفظ میں اشتراک کی وجہ سے۔ مثلاً لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (الانعام: ۱۰۳) کی تاویل میں اختلاف کہ اس سے ظاہری آنکھ مراد ہے یا دل کی آنکھ؟

(۲) کسی ایسے معاملے کی بنا پر جس کا تعلق نظم سے ہو۔ مثلاً وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا (النور: ۴-۵) میں یہ اختلاف کیا یہ استثناء صرف معطوف پر منحصر ہے یا معطوف ومعطوف علیہ دونوں پر؟

(۳) مفہوم مخفی ہو اور لفظ میں اختصار ہو۔ مثلاً وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرۃ: ۲۲۷)۔

اگر اس میں مذکور چیز کا تعلق امر یا نہی عقلی سے ہو تو اس کی توضیح کے لیے دلائل عقلیہ کا سہارا لیا جائے گا۔ اللہ تعالی نے خود اس پر ابھارا ہے: كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (ص: ۲۹)۔ اگر اس کا تعلق امر شرعی سے ہو تو اس کی توضیح کے لیے کسی محکم آیت یا واضح سنت کا سہارا لیا جائے گا۔ اگر اس کا تعلق اعتقاد سے ہو تو عقلی دلائل کا سہارا لیا جائے گا اور اگر اس کا تعلق عبرت پذیری کے واقعات سے ہے تو اس کے سلسلے میں قصص میں مذکور صحیح روایات کا سہارا لیا جائے گا۔[۶]

امر عقلی سے مراد وہ امر ہے جس کے حسن کا عقل تقاضا کرتی ہو اور گردش ایام سے اس میں کوئی تغیر نہ ہوتا ہو۔ خبر اعتقادی وہ خبر ہے جس میں اس چیز کا اظہار ہو جس پر یقین رکھنا ضروری ہے، مثلاً آیت کریمہ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النسائ: ۱۳۶)۔ عبرت پذیری سے متعلق خبر سے مراد وہ خبر ہے جو اس چیز کی بابت اطلاع فراہم کرتی ہو جس میں عبرت پذیری کا سامان ہو، جیسے سابقہ انبیاء اور گذشتہ قوموں کے واقعات، خلق ارض وسماوات سے متعلق معلومات۔ امر شرعی وہ امر ہے جس کے حسن کی معرفت کا انحصار ہماری عقل پر نہیں ہے اور انسانی مفادات کے لحاظ سے ان میں نسخ اور تبدیلی پیش آتی رہتی ہے۔ نہی شرعی کے قبح کی معرفت سے بھی ہماری عقل

عاجز ہے اوران کا فائدہ مخاطب کو اچھائیوں کے حصول اور برائیوں سے اجتناب پر آمادہ کرنا ہے۔تخاطب کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ مخاطب تک حق و باطل کا فرق پہنچا دیا جائے، تاکہ وہ باطل کے بجائے حق کی پیروی کرے۔امر و نہی کی ایک شکل جمیل وقبیح کے درمیان فرق بھی ہے، تاکہ وہ جمیل کا قصد کرے اور قبیح سے اجتناب کرے۔ ۷؎

امام اصفہانی کی تفسیر 'جامع التفاسیر' کا جائزہ لیتے وقت صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے دورانِ تفسیر ان تمام اصولوں کا لحاظ رکھا ہے۔مثلاً پہلا اصول کہ اگر کوئی امر یا نہی عقلی ہو تو اس کی توضیح وتشریح میں دلائل عقلیہ کا سہارا لیا جائے گا، بیان کرنے کے بعد انھوں نے اس کو مذکورہ آیتِ کریمہ پر تطبیق دی ہے: 'يَآأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الأَرْضِ حَلٰلاً طَيِّباً وَ لاَ تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ'' (البقرۃ:۱۶۸)۔انھوں نے لکھا ہے کہ 'الطیب' وہ چیز ہے جسے عقول صحیحہ پسند کرتی ہوں۔اس کے برعکس خبیث ہے۔حلال طیب سے عام ہے، اسی طرح حرام خبیث سے عام ہے ۔لہٰذا کوئی ایسی چیز بھی حرام ہوسکتی ہے جو بالذات عقلاً خراب نہ ہو ،جیسے ازلام کے ذریعہ تقسیم کردہ چیزوں کی حرمت،سونے چاندی کا استعمال، مردوں کا ریشم پہننا۔آیتِ کریمہ میں حلال اورطیب دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔اس کا مقصد ان امور کی اطلاع ہے جنھیں انسانی مزاج پسند کرتا ہے اورشریعت نے انھیں مباح ٹھہرایا ہے۔اور چوں کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں شیطان انسان کے سامنے آراستہ کرکے پیش کرتا ہے، جب کہ حقیقت میں وہ طیب نہیں ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے طیب کے مباح ہونے کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی فرمادیا: وَ لاَ تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ یہ کہہ کراس طرف اشارہ کردیا کہ اس کی عداوت صاحبِ نظر افراد سے مخفی نہیں ہے۔ ۸؎

تاویل کے سلسلے میں امام اصفہانی کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ''اگر کوئی شرعی حکم ہو تواس کی توضیح وتشریح کے لیے آیتِ محکمہ یا سنتِ مبیّنہ کا سہارا لیا جائے گا''۔اس اصول کی روشنی میں انھوں نے قرآن کریم کی تفسیر کرتے ہوئے عموماً قرآن و حدیث سے بہ کثرت استدلال کیا ہے۔اس کی ایک واضح مثال ہمیں آیت کریمہ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا

اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ إِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِيۡنَ (البقرۃ: ۱۵۳) کی توضیح و تشریح میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر پر ابھارا ہے، اس لیے کہ یہ ہر فعلِ خیر کا ذریعہ اور ہر قسم کے فضائل کی اساس ہے۔ اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''صبر کا ایمان میں وہی مقام ہے جو سر کا جسم میں ہے۔ صبر رخصت ہونے سے ایمان رخصت ہو جاتا ہے'' (مصنف ابن ابی شیبہ)۔ دوسری جگہ آپؐ نے ارشاد فرمایا، ''صبر سراسر خیر ہے'' اور نماز خشوع وخضوع اختیار کرنے اور فحش کو ترک کرنے پر آمادہ کرنے والی شئ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے'' (العنکبوت: ۴۵)۔ لہٰذا ذکر اور شکر کا حکم دینے کے بعد وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے صبر اور نماز سے مدد چاہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبر ایمان کی اساس اور شکر اس کی انتہا ہے۔ اس وجہ سے آپؐ نے فرمایا: ''صبر نصف ایمان ہے'' (بیہقی)۔ اور پھر آگے إِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِيۡنَ کہہ کر یہ واضح کر دیا گیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہے ۔جیسا کہ سورۂ طور میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعۡيُنِنَا''۔۹؎ تفسیر میں اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ۱۰؎

امام اصفہانیؒ کا تیسرا اصولِ تاویل یہ ہے کہ اگر کسی امر کا تعلق اعتقاد سے ہو تو اس کی تاویل کے سلسلے میں عقلی دلائل کا سہارا لیا جائے گا۔ مثال کے طور پر آیت کریمہ قُلۡ أَتُحَآجُّوۡنَنَا فِي اللّٰہِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡ وَلَنَا أَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ أَعۡمَالُكُمۡ وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ (البقرۃ: ۱۳۹) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''کسی معاملے کے حق میں واضح دلیل پیش کرکے مقابلہ کرنا 'محاجۃ' کہلاتا ہے۔ آیت کریمہ وَأَلۡزَمَهُمۡ كَلِمَةَ التَّقۡوٰى میں مذکور دلیل کو اس آیت کے ذریعہ ان پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اجمالی طور پر شریعت کی اساس تین چیزوں پر ہے: خالقِ کائنات کو تسلیم کرنا، اس کے مطابق عمل کرنا اور اخلاص کا ہونا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہہ دو کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اقرار اور اس کے مطابق عمل کرنے میں یکساں ہیں اور ہمارا امتیاز یہ ہے کہ ہمیں اخلاص حاصل ہے جب کہ تم اس سے محروم ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ اخلاص صرف مسلمانوں کا حصہ

ہے؟ یہ تو محض دعویٰ ہے، تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تدبر و تفکر پر آمادہ کیا ہے، تلاش و تحقیق اور تدبر و تفکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ عقائدی اصول درحقیقت وہی ہیں جنہیں اللہ تعالی نے سورہ نسائی:۶ ۱۳ وَمَن يَكْفُرْ بِاللهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ میں بیان کیا ہے۔اگر اللہ تعالی کے ساتھ یہود و نصاری اور مسلمانوں کے تعلق کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ مسلمان ہی مخلص ہیں۔ اس لیے کہ یہود اس کی مشابہت کے قائل ہیں، جب کہ نصاری تثلیث کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا دعوی ہے کہ جبریل ان کے دشمن ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یہود کا خیال ہے کہ وہ نبی نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک متقی شخص ہیں۔اسی طرح انہوں نے لوطؑ پر (نعوذ باللہ) نشے کی حالت میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ بدکاری کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہیں اور انہوں نے توریت وانجیل میں مذکور بعض احکام کا انکار کیا ہے۔بعث کے متعلق ان کا خیال ہے کہ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلاَّ أَيَّاماً مَّعْدُودَةً (البقرۃ:۸۰)۔نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ انہیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا، بلکہ ثواب وعقاب جو کچھ ہونا ہے، روح کے ساتھ ہوگا۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کا یہ کہنا کہ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ بالکل واضح ہے۔۱۱؎

امام اصفہانیؒ کا بیان کردہ آخری اصول تاویل یہ ہے کہ اگر کسی امر کا تعلق عبرت پذیری کے واقعات سے ہے تو اس سلسلے میں قصص میں بیان کردہ صحیح روایات کا اعتبار کیا جائے گا۔ یہ اصول بالکل واضح ہے اور ان کی تفسیر میں جا بجا اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً آیت کریمہ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْساً فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا. . . لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (البقرۃ:۲۔۷۳) کی تشریح میں انھوں نے اسرائیلیات اور ضعیف اور بے بنیاد روایات میں غور و خوض نہیں کیا ہے، بلکہ ان واقعات سے متعلق صرف صحیح روایات کی طرف رجوع کیا ہے۔ مقتول کو جسم کے کس حصے سے مارا گیا؟ اس کے متعلق کسی بات پر اعتماد نہ کرتے ہوئے انہوں نے وہب بن منبہ سے منقول تمام اقوال کو نقل کر دیا ہے، پھر لکھا ہے کہ آیت کا ظاہر کسی عضو کی تخصیص کا متقاضی نہیں ہے۔

مذکورہ مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ امام اصفہانیؒ نے اپنے مقدمۂ تفسیر میں

بیان کردہ اصول تاویل کی تطبیق کی کوشش کی ہے اور واضح طور پر اپنے منہج تفسیر میں اس کا التزام رکھا ہے۔

مولانا فراہیؒ کے اصولِ تاویل

مولانا فراہیؒ نے تاویل کے تین اصول بیان کیے ہیں۔ ان کو اختیار کر کے کتاب اللہ میں کج روی کا دروازہ بند کیا جا سکتا ہے: (۱) بنیادی اصول۔ (۲) ترجیحی اصول۔ (۳) باطل اصول (جن پر لوگوں نے اعتماد کیا ہے، حالاں کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان کا تذکرہ ان سے اجتناب کے لیے کیا جائے گا)۔

بنیادی اصول: جب کلام میں مختلف معانی کا احتمال نہ ہو تو ان کو اختیار کیا جائے گا۔

ترجیحی اصول: جب کلام میں مختلف معانی کا احتمال ہو تو ان کو اختیار کیا جائے گا۔
مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں کہ ”ترجیحی اصول کی مدد سے اقرب الی الصحۃ مفہوم تک ہماری رسائی ہوسکتی ہے۔ ۱۲؎ اس کے بعد انھوں نے ان اصولوں کی تشریح فرمائی ہے۔

مولانا فراہیؒ نے بنیادی اصول کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) نظم کلام اور سیاق و سباق کا لحاظ رکھنا: اس کا شمار ترجیحی اصول میں نہیں ہوگا، کیوں کہ کلام ایسے معنی کا متحمل نہیں ہوسکتا جو اس کے نظم اور سیاق کے موافق نہ ہو۔ انسانوں کا کلام نظم سے خالی نہیں ہوتا تو اللہ تعالی کا کلام کیوں کر اس سے خالی ہوسکتا ہے۔ یہ اصول بالکل واضح ہے، لیکن اہل زیغ نے اس کو پامال کر کے طرح طرح کی احادیث گھڑ لیں اور کم زور عقل مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلا کر دیا۔ اس کی ایک واضح مثال آیت تطہیر ہے۔ ۱۳؎ اس کا نزول اور اس کا تعلق صرف اور صرف امہات المومنین سے ہے، اس میں دوسروں کا کوئی دخل نہیں ہے اور کلام میں اس کے عموم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) شاذ معانی کا اعتبار نہیں ہوگا: اسے ہم نے ترجیحی اصول میں شامل نہیں کیا ہے، اس لیے کہ بسا اوقات ظاہر اور عامی لفظ کے بجائے بہترین لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کا استعمال ہوتا ہے تو وہ لازمی طور پر اپنے معلوم اور ثابت شدہ مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ اگر اس سے کوئی ایسا مفہوم مراد لیا جائے جو لوگوں میں غیر معروف ہے

اور کوئی اس مفہوم کا دعویٰ کرے، حالاں کہ اس کے اثبات کی گنجائش نہ ہو تو یہ اندھا پن ہے۔ قرآن کا نزول عربی مبین میں ہوا ہے، لہٰذا وہ فصیح ،معروف اور واضح کو چھوڑ کر شاذ، منکر اور غریب لفظ استعمال نہیں کرسکتا۔ جہاں تک اعلیٰ مطالب کا تعلق ہے تو وہ اس قبیل سے نہیں ہے، کیونکہ اس میں کلام اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہوتا ہے اور مطالب عالیہ درحقیقت مفہوم کے ضمن میں شامل ہوتے ہیں، وہ مفہوم کے خلاف اور اس کے برعکس نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال إِن تَتُوبَا إِلَى اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا (التحریم :۴) ہے۔ اہل باطل نے 'صغو' کو 'زیغ' کے مفہوم میں تبدیل کردیا اور اپنی باطل تاویل کے حق میں ایک باطل قراءت وضع کرلی، جو ثابت ہی نہیں، چہ جائے کہ متواتر ہو۔

(۳) کلام کی معرفت کے لیے اس کے بعض حصوں کا بعض سے تقابل اور نظائر، جس کا نام تفسیر القرآن بالقرآن ہے: قرآن کریم میں بہ کثرت کسی ایسے واقعہ کا اجمالی تذکرہ ہوتا ہے جس کی تفصیل وہ کسی دوسرے مقام پر پیش کرچکا ہوتا ہے اور اس کا مفہوم نفس کلام سے آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ انفال کی آخری آیات بطور مثال پیشِ خدمت ہیں۔ آیت کریمہ ہے: إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَاهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰہِ (الانفال:۷۲) اس کے بعد ہے: وَالَّذِيْنَ آمَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَاهَدُواْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰہِ۔ اس میں بأموالھم وأنفسھم محذوف ہے، جو سیاق کلام سے سمجھ میں آرہا ہے ۔اس کے بعد ہے: وَالَّذِيْنَ آمَنُواْ مِن بَعْدُ وَهَاجَرُواْ وَجَاهَدُواْ مَعَكُمْ (الانفال:۷۵) اس میں فی سبیل اللہ اور بأموالھم وأنفسھم کسی کا ذکر نہیں ہے، لیکن سیاق کلام سے پورا مفہوم سمجھ میں آرہا ہے اور 'معکم' کہہ کر اس کی دلیل فراہم کردی گئی ہے۔

مولانا فراہیؒ نے 'التکمیل فی اصول التاویل' کے مقدمہ میں نظم اور تاویل کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''تاویل کو نظم سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ اولاً میرا ارادہ نظم قرآن کو بیان کرنے کا تھا، جس کے لیے مجھے تاویل کی وضاحت کی ضرورت پیش آئی، پھر اس میں مجھے خیر کثیر ملا۔ کیوں کہ اس سے

قرآن کے اسرار و رموز کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، غلطیوں کا امکان کم ہوجاتا ہے۔ نظم کے ذریعہ میں نے ایک بڑی حقیقت کی راہ پالی"۔ ۱۴؎ اپنے اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "معنیٰ مراد کو سمجھنے کے طریقے دو ہیں: (۱) تفسیر القرآن بالقرآن۔ (۲) نظم کلام کی رعایت۔ اس کی توضیح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ زمانۂ قدیم سے علماء اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں اجمال ہے تو کہیں تفصیل۔ ایک جگہ جس چیز کا بیان موجود نہیں، دوسری جگہ اس کا ذکر کردیا گیا ہے۔ قرآن نے متعدد مقامات پر اپنی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ اسے ایک مستحکم اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا مقصد مختلف امور پر دلالت فراہم کرنا ہے۔ اس لیے کہ ایک ہی مفہوم مختلف عبارات میں مذکور ہوتا ہے۔ مثلاً اوقات نماز کی طرف اشارہ مختلف آیات میں ہے۔ ایک جگہ ہے: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (غافر: ۵۵) ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ (ق: ۳۹-۴۰)۔ ایک دوسرے مقام پر ہے: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِينَ تَقُومُ۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ (الطور: ۴۸-۴۹)۔ ایک اور مقام پر ہے: فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ۔ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ (الروم: ۱۷-۱۸) مزید ملاحظہ ہو (طہٰ: ۱۲۰۔ اور اسرائ: ۷۹)۔ ۱۵؎ آگے لکھتے ہیں کہ: "معانی پر دلالت کی مختلف صورتیں ہیں۔ بسا اوقات آیت کسی ایک مفہوم پر دلالت کرتی ہے جس سے کسی دوسری آیت میں مذکور مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ کبھی دو آیتیں یا دو جملوں کو ملا کر کسی ایسے مفہوم پر دلالت فراہم کی جاتی ہے جس میں ہلکا سا ابہام ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم دلائل کی ان صورتوں کو واضح کردیں تو اصل کا استعمال آسان ہوجائے گا"۔ ۱۶؎

مزید فرماتے ہیں: "اصول تاویل کے سلسلے میں دوسری اہم چیز نظم کلام کی رعایت ہے۔ کلام کے اندر کبھی لفظ میں اشتراک پایا جاتا ہے، کوئی لفظ حذف ہوتا ہے، کوئی مفہوم محذوف ہوتا ہے، کہیں وسط میں جملہ معترضہ آجاتا ہے اور کبھی اسالیب کی مختلف

صورتوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ مثلاً امر، استفہام اور عطف کے الگ الگ مفہوم میں۔ لہٰذا کلمات اور اسلوب بیان کے تمام دلائل کو جاننے کے بعد مراد اصلی کو جاننے کے لیے غور وفکر کیا جائے گا۔ اشتراک کی صورت میں معنیٔ اصلی کی تعیین کے کچھ خاص اصول ہیں۔ اسی طرح محذوف، مقدّر، سیاق کلام اور جملہ معترضہ کو جاننے کے بھی کچھ متعین اصول ہیں۔ ان میں سب سے مستحکم اور سب سے جامع اصول نظم کا پہلو ہے''۔۱۷؎

مولانا فراہیؒ کے نزدیک تفسیر کا ایک اہم اصول نظائر ہیں، جو ایک دوسرے کی توضیح کرتے ہیں۔ وہ فہم قرآن کی اساس ہیں۔ اس میں غور وفکر کی چند صورتوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ: (۱) پہلے نظم کلام اور حسن تاویل میں غور کرکے مجمل اور مقدّر جملوں کو واضح کیا جائے گا۔ اس سے نظائر کے درمیان مطابقت خود بخود واضح ہوجائے گی اور مجمل اور مقدر کی تعیین کے لیے ایک اور دلیل بھی فراہم ہوجائے گی۔ اس لیے کہ ایک جگہ جس چیز کا اجمالی تذکرہ ہے دوسرے مقام پر اس کی تفصیل پیش کردی گئی ہے۔ یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے۔

(۲) اگر دو کلاموں کے درمیان مطابقت معلوم ہے تو سابق ولاحق یعنی نظم قرآن پر غور کیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہر کلام کا ایک موزوں نظم ہوتا ہے اور ضروری نہیں ہے کہ دونوں مقام کا نظم یکساں ہو۔ اگرچہ اکثر نظائر میں کسی نہ کسی صورت میں مشابہت پائی جاتی ہے۔

نظائر کو ایک دوسرے پر محمول کرنے کے بھی مختلف اصول ہیں:

اگر کسی لفظ یا جملے کے اندر دو تاویلوں کا احتمال ہو (نظائر میں اکثر ایسا ہوتا ہے) تو اس سے کسی خاص تاویل کی تائید نہیں کی جائے گی، الاّ یہ کہ ایک تاویل راجح ہو۔ اگر راجح تاویل کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہوں تو کثرت نظائر اس کے راجح ہونے کی دلیل قرار پائے گی، ورنہ بہ صورت دیگر دونوں تاویلیں یکساں ہوں گی۔ اس کی مثال لفظ قرآن ہے۔ اس کا اطلاق جمع شدہ چیز پر ہوگا یا پڑھی جانے والی شئے پر۔ دونوں کے مجموعے پر اس کے اطلاق کی تاویل درست نہیں ہے۔ اگر اس کے نظائر جمع کیے جائیں تو

ہر ایک میں متلو (پڑھی جانے والی شی) کا مفہوم صحیح قرار پائے گا اور بعض میں راجح ہو گا، بعض میں صرف اسی کے لیے اس کا استعمال ہوا ہو گا۔۱۸؎

اس کے بعد ترجیحی اصول کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں کہ وجوہ واعتبارات میں اختلاف کی صورت میں اس چیز کو اختیار کیا جائے گا جو مقام اور عمود کلام سے زیادہ موزوں ہو۔ اس لیے کہ ہر لفظ کے اطراف اور جہات ہوا کرتی ہیں اور ان کی حیثیت ان کے معانی کی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر واقعہ کے مختلف اعتبارات ہوتے ہیں۔ جس طرح لفظ مشترک کی اس کے موقع ومحل کے لحاظ سے تاویل کی جائے گی، اسی طرح الفاظ و معاملات کی بھی موقع ومحل کے لحاظ سے تاویل ضروری ہے۔ مثلاً وحدانیت کی صفت اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے باوجود قرآن میں اللہ تعالی کا ذکر مختلف اسماء اور مختلف ترتیب سے آیا ہے۔ مثلا کہیں رب الناس، ملک الناس، اله الناس ہے تو کہیں رب العالمین، الرحمٰن الرحیم، مالک یوم الدین آیا ہے۔ کہیں الملک القدوس العزیز الحکیم ہے تو کہیں الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر ہے۔ جو شخص قرآن میں تدبر و تفکر سے کام نہیں لے گا اس کی توجہ کلمات کے موقع ومحل کی طرف مبذول نہیں ہوگی، نہ وہ لفظ کی جہت کو سمجھنے کی کوشش کر سکے گا۔ لیکن بصیرت اور دقّتِ نظر رکھنے والا شخص یقینی طور پر اس میں تدبر کرے گا، جس سے بعض نمایاں پہلو اس کے سامنے واضح ہو جائیں گے اور اس سے آگے تک اس کی رسائی ہو جائے گی۔ اگر صحیح طور پر اس اصول کی کسوٹی میسر آ گئی تو انبیاء ورسل کے اسماء کی ترتیب میں تدبر و تفکر آسان ہو جائے گا۔ ان کے درجات میں تفاوت کے باوجود تمھیں ان کے اسماء کے ذکر میں ایک خاص قسم کی ترتیب نظر آئے گی۔ اس کے موقع ومحل پر غور کرنے سے تمھیں دقیق اشارات حاصل ہوں گے اور ان کے موقع ومحل میں کوئی اشتباہ نہ ہو گا۔ اسی طرح احکام وقصص کی ترتیب میں بھی خاص اشارات نظر آئیں گے۔ خلاصہ یہ کہ کسی چیز کے اشارات واعتبارات کو موقع ومحل سے اس طرح اخذ کیا جائے گا جس طرح لفظ مشترک کا مفہوم موقع ومحل کے لحاظ سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اس

سلسلے میں پہلا اصول یہ ہے کہ احتمالات کی صورت میں نظم فیصلہ کن ہو گا۔ اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لفظ اگر مشترک نہیں ہے تو بھی اس کا ایک ہی مفہوم پر منحصر ہونا ضروری نہیں ہے، جیسا کہ بعض اہل رائے کا خیال ہے۔ اس لیے کہ لفظ مجاز بھی ہوتا ہے حقیقت بھی، عام بھی ہوتا ہے اور خاص بھی اور اس کے مفہوم کی مختلف صورتیں ہیں۔ موقع ومحل کے لحاظ سے وہ ان تمام معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ [۲۱] دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر کلام کے اندر متعدد احتمالات ہوں تو اس مفہوم کو اخذ کیا جائے گا جس کی نظیر باقی قرآن میں موجود ہو۔ قرآن سے جس مفہوم کی تائید نہ ہوتی ہو یا جس میں اختلاف ہو وہ متروک قرار پائے گا۔ مثلاً آیت کریمہ: أَنَّ اللّٰہَ یَحُولُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِہِ وَ أَنَّہُ إِلَیْہِ تُحْشَرُونَ (الانفال: ۲۴) کی دو تاویلیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالی تم سے زیادہ تمہارے اندروں سے واقف ہے اور دوسرا مفہوم یہ کہ وہ انسان کو اس کے ارادہ کی تکمیل سے باز رکھتا ہے۔ پہلے مفہوم کی نظیر قرآن میں موجود ہے اور نظم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ نیز نظم کی تاویل اسی مفہوم کے مطابق ہوگی جو قرآن سے مشابہ ہو۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ اللہ سے ڈرو، اس لیے کہ وہ تمہارے مخفی رازوں سے بھی آگاہ ہے اور تمہیں اس کے پاس جمع کیا جائے گا۔ آیت کا یہ مفہوم معنی اور نظم کی مشابہت کے لحاظ سے ہے۔ دوسری تاویل کی بنیاد مشابہت لفظی پر ہے ۔قرآن کریم میں ہے: وَحِیْلَ بَیْنَہُمْ وَ بَیْنَ مَا یَشْتَہُوْنَ (سبا: ۵۴) یعنی اپنی خواہشات کی تکمیل سے انہیں روک دیا گیا۔ یہ بھی ایک اصول ہے، لیکن مذکورہ بالا اصول کے مقابلہ میں انتہائی ناقص ہے ۔ کیوں کہ لفظ مشترک مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس میں سیاق و سباق اور صحت معنی کو پیش نظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ [۲۰] اسی طرح اس کی ایک واضح مثال آیت کریمہ: اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً (النحل: ۲۰) میں لفظ 'امۃ' کا استعمال ہے۔ یہاں اس کا وہ عام مفہوم مراد نہیں ہے جو دوسرے مقامات پر اس سے مقصود ہے، کیوں کہ سیاق و سباق اور صحت معنی سے یہ پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے ۔ یہاں جو مفہوم مراد ہے، لفظ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے ۔قرآن کریم میں دیگر مقامات پر لفظ امۃ کا استعمال تین معانی میں

ہوا ہے۔ (۱) کسی خاص مدت کے لیے (ہود: ۸) (۲) کسی مخصوص گروہ کے لیے (القصص: ۲۳) (۳) شاہ راہ، طریقۂ کار کے لیے (البقرۃ: ۲۱۳)۔ لیکن پہلے اور دوسرے اصول کو اختیار کرنے سے اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ پہلے اصول کے لحاظ سے لفظ 'قانتاً' اس کے بعد اس کی تفسیر کے طور پر آیا ہے۔ اس صورت میں 'امۃ' کا مفہوم خود سپردگی اور مکمل اطاعت ہوگا اور یہ قانت کے لحاظ سے موزوں بھی ہے۔ دوسرے اصول کے لحاظ سے اس بات کے مختلف نظائر قرآن میں موجود ہیں کہ آپؑ کی صفات میں ایک اہم صفت اطاعتِ کاملہ کی بھی ہے۔ البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ لفظ 'امۃ' فرماں بردار کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ جمہور اہل لغت کی نگاہوں سے لفظ 'امۃ' کا یہ مفہوم مخفی رہ گیا، اگرچہ انھوں نے اس سے ملتا جلتا مفہوم بیان کیا ہے۔

ترجیحی اصول کی مولانا فراہیؒ نے چند قسمیں بیان کی ہیں: (الف) اگر مفہوم کسی ایسی عبارت کا متقاضی ہے جو کلام میں مذکور نہیں ہے تو وہ معنی مرجوح قرار پائے گا۔ اس کی واضح مثال تغنّی بالقرآن کے مفہوم کی تشریح میں امام شافعیؒ اور سیدہ عائشہؓ کا بیان کردہ استدلال ہے۔ (ب) عربیت کے لحاظ سے جو مفہوم زیادہ نمایاں ہو اسے اختیار کیا جائے گا۔ اس کی مثال آیت کریمہ: 'نَزَّاعَةً لِلشَّوٰی' میں 'شوی' کا مفہوم ہے۔ کلام عرب میں عموماً یہ پنڈلی کے گوشت کے لیے مستعمل ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ سے آیت کریمہ: 'نَزَّاعَةً لِلشَّوٰی' کے ترجمہ میں سہو ہوا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس سے مراد جگر ہے، حالاں کہ سیاق عذاب کے قریب ہونے کا ہے، نہ کہ منکرین کے آگ میں دخول کا۔ اس لیے کہ آیت کریمہ اس جائے قیام کی توضیح وتشریح کے سلسلے میں وارد ہے جس روز کہ جنت اہل تقوی سے قریب کر دی جائے گی اور جہنم گم راہوں کے سامنے بالکل نمایاں کر دی جائے گی۔ اس وقت جہنم کفار کو پکارے گی، اس کے شعلے اٹھیں گے اور ان کی پنڈلی کے گوشت کو جلا کر ختم کر دیں گے۔ آگ کے ان کفار کا جگر نکال لینے کا مفہوم قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جب کفار جہنم میں داخل ہو جائیں گے اس وقت بھی وہ ان کے جگر اور دل کو نہیں نکالے گی۔ جن مفسرین نے 'شوی' کے معنی 'سر کی کھال' لیے

ہیں، ان پر نقد کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں: ''پنڈلی کے گوشت کے لیے لفظ 'شوی' کا استعمال عام ہے، سر کی کھال کے لیے کہیں کہیں لفظ 'شواۃ' کا استعمال ہوا ہے، اگر چہ اس میں دیگر معانی کے احتمالات بھی ہیں۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی جائے وقوع پر اوپر سے آگ کی آمد کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ جب وہ ان سے قریب ہوگی تو ان کے سر کی کھال کو کھینچ لے گی۔ اگر لفظ 'شوی' کے دونوں مفہوم یکساں درجہ کے مان بھی لیے جائیں تو اس مفہوم کو اخذ کرنا، جو نظم کلام اور باقی قرآن کے موافق ہے، زیادہ موزوں ہوگا۔ لہٰذا سر کی کھال کیسے مراد لی جاسکتی ہے، جب کہ معنی غیر معروف اور مبہم ہے'' ۔۲۱؎

امام فراہیؒ کے بیان کردہ اصول (اگر کسی کلام کے اندر مختلف وجوہ ہوں تو سب سے راجح مفہوم کو اختیار کیا جائے گا) کا تقاضا ہے کہ شاذ اور منکر کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ سب سے راجح مفہوم اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کلام عرب اور بقیہ قرآن سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہو۔ تکلّفاً ایسا نہیں کیا جائے گا۔ مولانا نے بطور مثال آیت کریمہ: لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ إِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُولاً مِّنۡ أَنفُسِهِمۡ (آل عمران: ۱۶۴) کو پیش کیا ہے۔ اس کی ایک قراءت (أنفسهم ف پر فتحہ کے ساتھ) ہے۔ اس تاویل کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کیونکہ یہ شاذ مفہوم پر مشتمل ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر رسول کے اپنی ہی قوم کے ایک فرد ہونے کی شہادت دی ہے اور یہ بالکل واضح ہے۔ نبی کا اپنی قوم کے ایک فرد ہونے میں کوئی عیب بھی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ کلام عرب میں اس طرح کی کوئی مثال بھی نہیں ملتی۔ عرب عام طور پر اپنی گفتگو میں 'هو من خيارهم وعليائهم' (وہ اپنی قوم کا سب سے برگزیدہ اور سر بلند شخص ہے) کا استعمال کرتے ہیں۔ نیز اگر کسی قوم کے اندر ہی سے کوئی نذیر و بشیر کھڑا کیا جائے تو اس قوم پر اللہ کا فضل بھی زیادہ ہوگا۔ خود حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں بھی انہی میں سے ایک رسول کی بعثت کا ذکر ہے۔۲۲؎

آخر میں مولانا فراہی نے چوتھا اصول (جو سراسر باطل ہے) بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ کیا حدیث کی تاویل قرآن سے یا قرآن کی تاویل حدیث سے کی جائے گی؟ پہلے وہ

ذکر کر چکے ہیں کہ اس اصول کا ذکر محض اجتناب کے لیے کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ان کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''ہدایت اصلاً قرآن کریم سے اخذ کی جائے گی اور اسی پر دین کی بنیاد استوار ہوگی، پھر احادیث پر غور کیا جائے گا۔ اگر حدیث میں کوئی ایسی بات نظر آئے جو بہ ظاہر قرآن سے متصادم ہو تو قرآن مجید کی روشنی میں اس پر غور کیا جائے گا۔ اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی راہ نکل آئے تو ٹھیک ہے، ورنہ حدیث کے باب میں توقف سے کام لیا جائے گا اور قرآن پر عمل کیا جائے گا۔ ۲۳ ؎

مولانا فراہیؒ کے بیان کردہ اصول تاویل یہی ہیں۔ کیا وہ اپنی تفسیر 'نظام القرآن' میں عملی طور پر ان اصولوں کی تطبیق کر سکے ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ ان کی تفسیر کا عمومی جائزہ لے کر قاری آسانی سے اس کے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے۔

امام اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کے اصولِ تاویل کا موازنہ

امام اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کے اصول تاویل میں زمانی بُعد کے باوجود ہمیں کوئی جوہری اور بنیادی قسم کا اختلاف نظر نہیں آتا۔

(۱) دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تاویل میں نظم کلام اور سیاق وسباق کا لحاظ ضروری ہے۔ امام اصفہانیؒ نے لکھا ہے کہ ''مستکرہ (ناموزوں) تاویل کی وہ قسم ہے کہ جب اسے تاویل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ناگواری کا احساس ہو اور جھوٹی آمیزشوں سے اس میں قباحت پیدا ہو جائے''۔ مولانا فراہیؒ اس اصول تاویل میں امام اصفہانیؒ سے پوری طرح اتفاق رکھتے ہیں، لیکن اسے انھوں نے دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''جب لفظ خاص ہو اور اس کی تخصیص پر کوئی دلیل موجود ہو تو اس کو عام قرار دینا درست نہیں''۔ اسی وجہ سے دونوں نے الگ الگ مثالیں پیش کی ہیں۔

(۲) دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شاذ مفہوم ناقابل التفات ہوگا۔ سورۂ انعام: ۳۸ اور سورۂ فاطر: ۲۴ کو خلط ملط کر کے بعض افراد نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ حیوانات بھی مکلف ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے ترجیحی اصول میں پُر زور انداز میں کہا ہے کہ شاذ لفظ متروک قرار پائے گا۔

(۳) دونوں کا ضعیف احادیث کے قابل اعتماد نہ ہونے پر اتفاق ہے۔ امام اصفہانیؒ کے یہاں جھوٹی اور بے بنیاد روایت کی بنیاد پر کی گئی ہر تفسیر ناپسندیدہ ہے۔ اس طرح کی روایات کا رواج عموماً ان لوگوں کے یہاں بہ کثرت ہے جنہیں علم حدیث کی صحیح واقفیت نہیں ہے۔ مولانا فراہی نے بھی اسے ایک ناقابل اعتماد اصول قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''قرآن کو اس کے ظاہری مفہوم سے پھیرنے کے لیے کسی کم زور دلیل پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک ظاہر کو ہی اصل اور رجحت کی حیثیت حاصل ہوگی''۔

(۴) دونوں کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ معنیٔ مراد کو سمجھنے کا سب سے قابل اعتماد اور باوثوق ذریعہ تفسیر القرآن بالقرآن اور نظم کلام کی رعایت ہے۔

اگر ہم دونوں کے درمیان نقطۂ اختلاف کی بات کریں تو اس کی حیثیت جزوی ہے، جو تقسیم و تطبیق کے لحاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ تقسیم کے اعتبار سے امام اصفہانیؒ کے یہاں اصول تاویل کی دو قسمیں ہیں: (۱) مستنکرہ (ناموزوں) (۲) منقاد (موزوں)۔ مولانا فراہیؒ نے اسے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے: (۱) بنیادی اصول۔ (۲) ترجیحی اصول۔ (۳) باطل اصول۔ تطبیق کے لحاظ سے جائزہ لیں تو امام اصفہانیؒ کے یہاں فروق لغویہ اور وجوہ و نظائر کا اہتمام کچھ زیادہ نظر آتا ہے، جب کہ مولانا فراہیؒ نے ساری توجہ نظم قرآن پر مرکوز کی ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ امام اصفہانی کی مفصل سوانح جاننے کے لیے دیکھیے: البلغۃ فی تاریخ أئمۃ اللغۃ للفیروزآبادی، ص ۶۹، تاریخ حکماء الاسلام للبیھقی ظھیر الدین، ص ۱۱۲، بغیۃ الوعاۃ للسیوطی: ۲۹۷/۲، روضات الجنات للخوانساری ص ۲۴۹، الاعلام للزرکلی: ۲۷۹/۲، معجم المؤلفین لعمر رضا کحالۃ: ۵۹/۴، کنوز الاجداد لمحمد کرد علی، ص ۲۶۸۔

۲۔ رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، ص ۲۰۷

۳۔ رسائل الامام الفراہی، ص ۲۲۳

۴۔ رسائل الامام الفراہی، ص ۲۲۵، (حاشیہ)

۵۔ محقق کتاب ڈاکٹر احمد حسن فرحات نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ غالباً موضوع حدیث سے امام اصفہانی کی

مراد آیت کریمہ سے متعلق ابن کثیر کی بیان کردہ روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''ایک عظیم نور ہوگا جس کے سامنے وہ سجدہ ریز ہوجائیں گے''۔ اس حدیث کی سند میں ایک مبہم شخص ہے۔ اس بنا پر یہ ضعیف ہے۔ ڈاکٹر فرحات کی یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ضعیف حدیث سے موضوع حدیث پر استدلال کیسے ممکن ہے، جبکہ دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام اصفہانی سے یہاں سہو ہوگیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ موضوع حدیث سے استدلال کر کے بعض افراد نے جارحۃ مراد لیا ہے، جب کہ جارحہ کے باب میں وارد حدیث صحیح ہے۔ امام بخاری و مسلم نے اس کی تخریج کی ہے۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے شوکانی نے لکھا ہے کہ '' امام بخاری وغیرہ نے ابوسعید کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ رب تعالیٰ لوگوں کے سامنے نمودار ہوگا اور ہر مومن مرد و عورت اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجائیں گے۔ اور دنیا میں جو لوگ شہرت اور دکھاوے کی خاطر سجدہ کرتے ہیں وہ کھڑے رہ جائیں گے۔ وہ سجدہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے تو ان کی پشت سخت ہوجائے گی''۔ امام شوکانی نے لکھا ہے کہ یہ روایت صحیحین اور دیگر کتب حدیث میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ امام احمد نے مسند (۱۷/۳) میں، امام بخاری نے کتاب التفسیر (۴۹۱۹) میں، امام مسلم نے کتاب الایمان (۳۰۲) میں اور دارمی نے اپنی سنن (۳۲۶/۲) میں اسے نقل کیا ہے۔ جہاں تک ضعیف حدیث کا تعلق ہے تو اسے ابویعلی، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردویہ اور البیہقی نے اسماء وصفات کے باب میں روایت کیا ہے۔ ابن عساکر نے ابوموسیٰ کے واسطے سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ ''ایک عظیم نور ہوگا جس کے سامنے وہ سجدہ ریز ہوجائیں گے''۔ ابن کثیر (۹۱/۷) نے لکھا ہے کہ اس میں ایک شخص مبہم ہے۔ ہمارے نزدیک اگر حدیث سے مراد تاویلاً نور ہے تو حدیث ضعیف ہے اور اگر اس سے مراد حقیقت ہے تو حدیث موضوع ہے، لہٰذا آیت سے اس کی مراد پر استدلال کیسے درست ہوسکتا ہے۔ فتح القدیر للشوکانی، تحقیق عبدالرحمٰن عمیرۃ، دارالوفاء، المنصورۃ، مصر، ۱۹۹۷ئ، ۳۶۸/۵۔۳۶۹۔

۶۔ مقدمہ جامع التفاسیر، ص ۴۹۔۵۱۔ ۷۔ حوالہ سابق، ۴۳، ۴۴ (بہ اختصار)

۸۔ ملاحظہ کیجیے امام اصفہانی کی تفسیر سورۂ بقرہ۔ اسے ڈاکٹر محمد اقبال فرحات نے اپنے تحقیقی مقالہ 'الراغب الاصفہانی و منہجہ فی التفسیر' میں ایڈٹ کر کے شائع کردیا ہے۔ اس مقالے پر زیتونہ یونیورسٹی تونس سے ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ یہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

۹۔ الراغب الاصفہانی و منہجہ فی التفسیر، ص ۳۷۶۔۳۷۷

۱۰۔ بطور مثال درج ذیل صفحات دیکھے جا سکتے ہیں ، ۱۵۲۔ ۱۵۳، ۱۸۰۔۱۸۱، ۲۲۷، ۲۳۳، ۲۳۳، ۳۳۰، ۴۲۴، ۵۵۵۔

۱۱۔ تفسیر الراغب الاصفہانی ،تحقیق د۔محمد اقبال فرحات ،ص ۳۵۸

۱۲۔ ایضاً ص ۲۶۲

۱۳۔ آیت تطہیر سے مولانا فراہی کی مراد سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۳ ہے: إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً۔ اس میں مذکور 'اہل بیت' کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ابن عباس ،عکرمہ،عطائ ،مقاتل اورسعید بن جبیر کے نزدیک اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک بیت سے مراد بیت النبی اور ازواج مطہرات کے مساکن ہیں۔ اس لیے کہ آیت کریمہ ہے وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ۔ نیز سیاق کلام ازواج مطہرات کے سلسلے میں چلا آرہا ہے۔ملاحظہ ہو: يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ۔ ۔ ۔إِنَّ اللهَ كَانَ لَطِيفاً خَبِيراً (احزاب:۲۸-۳۴) ابوسعید خدری، مجاہد، قتادہ اور کلبی کے نزدیک 'اہل بیت' سے مراد خصوصی طور پر علی ، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آیت کا اسلوبِ خطاب مردوں کے لیے موزوں ہے،عورتوں کے لیے نہیں۔ان کا اشارہ آیت کریمہ 'عنکم ولیطھرکم' سے ہے۔ اگر یہ عورتوں کے ساتھ مخصوص ہوتا تو 'عنکن ویطھرکن' ہوتا۔قرطبی نے بھی اسی رائے کو راجح قرار دیا ہے۔ملاحظہ ہو،احکام القرآن ،دارالکتب العلمیۃ ، بیروت، ۱۹۸۸ئ: ۱۴/۱۱۹ومابعد۔

۱۴۔ رسائل الامام الفراہی، ۲۰۹

۱۵۔ حوالہ سابق،ص ۲۴۲

۱۶۔ حوالہ سابق،ص ۲۴۲

۱۷۔ حوالہ سابق،ص ۲۴۳

۱۸۔ حوالہ سابق،ص ۲۶۵

۱۹۔ حوالہ سابق،ص ۲۶۷، ۲۶۸

۲۰۔ حوالہ سابق،ص ۲۶۹

۲۱۔ حوالہ سابق،ص ۲۷۲ ومابعدہ (بالاختصار)

۲۲۔ حوالہ سابق،ص ۲۷۳۔ ۲۷۴

۲۳۔ حوالہ سابق،ص ۲۷۵۔ ۲۷۶

ماخذ: مجلۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ، جامعہ کویت، جلد ۲۱، شمارہ ۶۷، ذوالقعدۃ، ۱۴۲۷ھ/دسمبر ۲۰۰۵ء

☆☆☆

نقد و استدراک

غیبت - بدکاری سے زیادہ سنگین جرم؟

ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف

مجلہ تحقیقات اسلامی کے شمارہ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۳ء میں محترمہ ڈاکٹر زاہدہ شبنم صاحبہ کا مضمون 'غیبت۔ اقسام اور حدود' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں کئی تسامحات پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان کا تذکر کیا جاتا ہے:

(۱) محترمہ صفحہ ۷۴ پر لکھتی ہیں کہ ''غیبت کرنا عذابِ قبر کا باعث ہے۔ایک مرتبہ آپؐ دو قبروں کے پاس سے گزرے۔ آپؐ نے فرمایا: ''ان دونوں کو عذاب دیا جارہاہے، حالاں کہ جن معاملوں میں یہ لوگ عذاب میں مبتلا ہیں وہ بہت بڑے نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک چغلی کرتا تھا اور دوسرا پیشاب کرتے وقت آڑ نہیں کرتا تھا''۔

سوال یہ ہے کہ جب غیبت بدکاری سے زیادہ سنگین جرم ہے (جیسا کہ انھوں نے اپنے مضمون میں دیگر احادیث کی روشنی میں ثابت کیا ہے) تو اس حدیث میں اس کے 'بڑا گناہ' ہونے کی نفی کیوں کی گئی ہے؟ صحیح بخاری کی جس حدیث کا اُنہوں نے حوالہ دیا ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں: إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ 'ثم قال :بَلٰى 'أَمَّا أَحدُهُمَافكَانَ يَسْعٰى بِالنَّمِيْمَةِوأَمَّا الآخَرُ فكَانَ لاَيَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِه[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں کبیرہ گناہ ہیں، لیکن لوگ انھیں کبیرہ نہیں سمجھتے۔

(۲) صفحہ: ۷۶-۷۷ پر لکھتی ہیں: ''غیبت کرنے والے کی عبادات قبول نہیں ہوتیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمیوں نے ظہر یا عصر کی نماز ادا کی۔ وہ دونوں روزے سے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا: دوبارہ وضو کرکے

پھر سے نماز پڑھو اور تمہارا روزہ بھی ٹوٹ گیا، اس کی قضا کرو۔ انہوں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ آپؐ نے فرمایا: اس لیے کہ تم دونوں نے ابھی فلاں شخص کی غیبت کی ہے۔''

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: إنَّ رجلین صَلَّیا صلاۃ الظھر و العصر و کانا صائمین' فلما قضَی النبي ﷺ لصلاۃ قال: أعیدا وضوء کما و صلاتکما و امضیا في صومکما و اقضیاہ یوماً آخر' قالا: لِمَ یا رسول اللہ؟ قال: غتبتم فلاناً[۲]

یہ روایت موضوع ہے۔ کیونکہ:

-اس کا راوی یوسف بن یعقوب ابو عمر نیشا پوری ہے، جو ابو بکر ابن ابی شیبہ کا شاگرد ہے، اس کے بارے میں حافظ ابو علی نیشاپوریؒ فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے طویل سفروں میں کسی نیشاپوری کو جھوٹ بولتے ہوئے نہیں دیکھا، سوائے ابو عمر نیشاپوری کے، کہ وہ جھوٹ بولا کرتا تھا''۔[۳]

-اس کا ایک راوی عباد بن منصور ناجی ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں: مدلّس اور صاحب مناکیر تھا۔[۴]

-یہ روایت معنعن ہے اور امام نوویؒ لکھتے ہیں: ''المدلِّس إذا قال: 'عن' لا یُحتجُّ بہ و لو کان عدلاً ضابطا''[۵] (مدلس کی 'عن' والی روایت نا قابل استدلال ہوتی ہے، اگر چہ وہ عدل وضابط ہی کیوں نہ ہو۔)

(۳) صفحہ: ۷۷ پر محترمہ لکھتی ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے غیبت کو بدکاری سے زیادہ سنگین جرم قرار دیا ہے۔ سیدنا ابو سعیدؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: غیبت زنا سے زیادہ سنگین ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: آدمی زنا کرنے کے بعد توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دیتا ہے [دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے] جب کہ غیبت کرنے والے کو اُس وقت تک نہیں بخشا جاتا جب تک کہ وہ شخص نہ معاف کرے جس کی غیبت کی گئی ہے۔''

اس روایت کی صحت بھی محل نظر ہے۔ اسے خطیب تبریزی نے مشکاۃ المصابیح: ۴۸۷۴-۴۸۷۵ میں سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہما کی سند سے اور ۴۸۷۶ میں سیدنا انسؓ کی سند سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: صاحب الزنا یتوبُ و صاحب الغیبۃ

لیس لہ توبۃ۔ پھر لکھا ہے: روی البیهقي الأحادیث الثلاثۃ في شعب الإیمان۔
اول الذکر روایت امام بیہقی کی شعب الایمان (۵ / ۳۰۶ حدیث :۶۷۴۱) اور حافظ طبرانی کی معجم اوسط (۵/ ۶۳ حدیث: ۶۵۹۰) کی ہے۔ اس کا سارا دارو مدار عباد بن کثیر ثقفی بصری پر ہے، جس کو امام بخاری اور امام نسائی متروک الحدیث کہتے ہیں۔[۶] حافظ ابن حِبانؒ اور حافظ ذہبیؒ نے اس کی جھوٹی روایتوں میں زیر بحث روایت نمونہ کے طور پر پیش کی ہے۔[۷]

سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب یہ روایت امام ذہبی نے میزان الاعتدال (۱ / ۴۴۷ ترجمہ حامد بن آدم المروزی: ۱۶۷۱) میں بھی نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ حافظ سلیمانی نے اس راوی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ احادیث وضع کرنے میں مشہور ہے۔ ابو داؤد سنجی کہتے ہیں: میں نے امام ابن مَعین سے پوچھا کہ حامد بن آدم یہ حدیث بیان کرتے ہیں: الغیبۃ أشد من الزنا۔ اس کے متعلق آپ کچھ فرمائیں گے؟ انہوں نے جواب دیا: ''هذا کذّاب' لعنہ اللہ''[۸] (یہ جھوٹا ہے۔ اس پر اللہ کی لعنت ہو۔) امام جوزجانی اور حافظ ابن عدی فرماتے ہیں: ''کان یَکذِبُ ویَحمِقُ في الکذب''[۹] (احمقانہ اور ناقابل یقین جھوٹ بولتا تھا۔)

سیدنا انس بن مالکؓ کی روایت کو امام بیہقی نے شعب الایمان[۳۰۶/۵، حدیث: ۶۷۴۲] میں نقل کیا ہے، لیکن اس کی سند میں دو راوی مجہول ہیں۔ امام صغانیؒ اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ روایت موضوع ہے''۔[۱۰] امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں: ''یہ روایت بالکل بے اصل ہے۔''[۱۱]

محدثین نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ سفیان بن عیینہ کا قول ہے، مرفوع حدیث نہیں ہے اور یہی بات درست ہے۔[۱۲] پھر اس پر یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ زنا کی شرعی حد قرآن وسنت میں موجود ہے۔ اگر غیبت زنا سے بھی بڑھ کر گناہ کا کام ہے تو اس کی شرعی سزا کیا ہوگی؟

(۴) صفحہ نمبر ۸۷ پر ذیلی عنوان 'غیبت کا کفارہ' کے تحت موصوفہ لکھتی ہیں:
''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی آسانی کے لیے گناہوں کے کفارات مقرر کیے ہیں، تاکہ

ان کے اثرات ختم ہو جائیں۔ حدیث میں غیبت کا کفارہ بھی منقول ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''إنّ من کفّارة الغیبةِ أن تستغفر لمن اغتبته، تقول: أللھم اغفر لنا وله'' (غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تم اُس شخص کے لیے دعا کرو جس کی غیبت کی ہو اور کہو: اے اللہ! ہمیں اور اسے دونوں کو معاف کردے۔)

امام بیہقی نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے: ''اس کی سند ضعیف ہے''۔ ۱۳؎ خطیب تبریزی نے بھی مشکاۃ میں امام بیہقی کا یہ قول نقل کیا ہے، مگر معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر صاحب نے اسے حذف کر دیا۔ حافظ ذہبیؒ اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ حدیث منکر ہے۔ اس کا راوی ابو سلیمان داود بن عبد الجبار ہے، جس کے بارے میں امام ابن مَعینؒ نے کہا ہے کہ وہ ثقہ نہیں ہے۔'' ۱۴؎

غیبت ایک گھناؤنا سماجی جرم ہے۔ اس کی شناعت واضح کرنے کے لیے قرآن کریم اور صحیح احادیث کے بیانات کافی ہیں، ضعیف اور موضوع احادیث کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر افترا کرنا اور جھوٹی حدیث بیان کرنا بدترین گناہ ہے۔ موضوع روایت بیان کرنے والوں کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:

مَنْ حَدّثَ عَنّي بِحَدِيْثٍ يُرَىٰ أَنّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِين ۔ ۱۵؎

''جس نے میری طرف سے حدیث بیان کی، یہ جانتے ہوئے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹے راویوں میں سے ایک ہوگا۔''

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

'' مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوّ أْمَقْعَدَهُ مِنَ النّار'' ۱۶؎

''جو کوئی مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں جان لے۔''

علمائے امت کا رویہ موضوع روایات کے سلسلے میں نہایت سخت رہا ہے۔ امام ابن صلاحؒ فرماتے ہیں:

''ولاتَحِلّ روایتُه لأحدٍ عَلِمَ حاله فیأيِّ مَعْنًی کان إلاّ مقروناً ببیان وضعه۔'' ۱۷؎

''جس کو کسی روایت کا موضوع ہونا معلوم ہوجائے اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے موضوع کہے بغیر بیان کرے۔''

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

و اتفقوا علی تحریم روایۃ الموضوع إلا مقرونا ببیان وضعه [۱۸]

''محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ موضوع روایت کو بیان کرنا حرام ہے۔ صرف اس وقت اس کی اجازت ہوگی جب ساتھ ہی اس کا موضوع ہونا بیان کیا جائے۔''

حواشی ومراجع

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب عذاب القبر من الغیبۃ والبول، حدیث:۱۳۷۸

۲۔ بیہقی، شعب الایمان: ۵/ ۳۰۳، مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۴۸۷۳

۳۔ تاریخ بغداد: ۱۴/ ۳۲۰

۴۔ جامع التحصیل، ص۱۰۷، تعریف اہل التقدیس، ص۱۲۹

۵۔ شرح المہذب: ۴/ ۱۷۵

۶۔ بخاری، التاریخ الکبیر: ۶/ ۴۳: ترجمہ: ۲۱۶۴، نسائی، الضعفاء والمتروکین ترجمہ: ۴۰۸، مجمع الزوائد: ۸/ ۹۲

۷۔ ابن حبان، المجروحین: ۲/ ۱۵۸، ترجمہ: ۷۸۸، ذہبی، میزان الاعتدال: ۲/ ۲۷۳، ترجمہ: ۴۱۳۴

۸۔ میزان الاعتدال: ۱/ ۷۴۴، ترجمہ: ۱۶۷۱

۹۔ احوال الرجال، ص۲۰۶، ترجمہ: ۲۸۱، الکامل فی ضعفاء الرجال: ۳/ ۴۰۹، ترجمہ: ۵۶۹

۱۰۔ کشف الخفاء ومزیل الالباس: ۲/ ۱۰۶، حدیث: ۱۸۱۲

۱۱۔ علل الحدیث: ۲/ ۳۱۹، حدیث: ۲۴۷۴

۱۲۔ شعب الایمان: ۵/ ۳۰۶، مرقاۃ المفاتیح: ۸/ ۶۱۰

۱۳۔ الدعوات الکبیر: ۲/ ۲۱۳، حدیث: ۵۷۵

۱۴۔ تذکرۃ الحفاظ: ۳/ ۹۶۷-۹۶۸

۱۵۔ صحیح مسلم، مقدمہ: ۱/ ۹، مسند احمد: ۴/ ۲۵۰، ۲۵۵، ۵/ ۱۴، ۲۰، مشکل الآثار: ۱/ ۱۷۵

۱۶۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی ﷺ، حدیث: ۱۰۷

۱۷۔ مقدمہ ابن الصلاح، ص۱۳۰-۱۳۱

۱۸۔ شرح نخبۃ الفکر، ص۸۱

☆☆☆

وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع پر قابلِ قدر تصنیف

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کردیتا ہے؟ کیا اس میں مذہبی رواداری تحمل وبرداشت اور توسع نہیں پایا جاتا ہے؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں کو سلام، مساجد میں ان کا داخلہ اور ان سے تحائف کے تبادلہ کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس پر کیا اعتراضات کیے جاتے ہیں؟ جہاد کیا ہے اور اس کے احکام کیا ہیں؟ ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں سے عدم تعلق کی ہدایات کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

کتاب میں اس نوع کے تمام مباحث پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اور مستند مفسرین، محدثین اور فقہاء کے حوالوں کے ساتھ عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس کی خصوصی اہمیت ہے اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی بھی یہ ایک اہم ضرورت ہے۔

مصنف کی نظر ثانی کے بعد جدید ایڈیشن، آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوب صورت جلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت:۔/۱۸۵ روپے

رپورٹ سمینار

تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار

ترتیب: ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، مولانا کمال اختر قاسمی، مولانا مزمل کریم قاسمی

الحمدللہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کے زیر اہتمام 'تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار' کے موضوع پر دو روزہ سمینار کا انعقاد ۲۳۔۲۴ر فروری ۲۰۱۴ء کو ہوا۔ اس کے آٹھ علمی اجلاسوں میں چالیس سے زیادہ مقالات پڑھے گئے۔ ان میں دو عربی، چار انگریزی اور باقی مقالات اردو زبان میں تھے۔ پانچ مقالات ایسے تھے جن کی خواندگی بعض اسباب سے نہیں ہوسکی۔ افتتاحی اور تاثراتی اجلاس ان کے علاوہ تھے۔ ان میں مقالات اور صدارتی خطابات کے علاوہ خصوصی خطابات بھی ہوئے۔ تمام اجلاسوں میں سوال وجواب اور تاثر وتبصرہ کے لیے بھی وقت مخصوص تھا، جس میں شرکاء نے کافی دلچسپی سے حصہ لیا۔

افتتاحی اجلاس:

افتتاحی اجلاس کا آغاز ۲۳ر فروری ۱۰ بجے صبح ادارہ کے وسیع میدان میں ہوا۔ خیر مقدمی کلمات ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی سکریٹری ادارہ نے پیش کیے۔ انھوں نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں تہذیب و سیاست کے فکری وعملی اقدامات، خاص طور پر گزشتہ ایک صدی کے دوران میں عالم اسلام میں برپا ہونے والی اسلامی تحریکات کی پیش رفت پر روشنی ڈالی۔ اس ضمن میں ادراہ کے بانی صدر مولانا صدرالدین اصلاحی مرحوم اور موجودہ صدر مولانا سید جلال الدین عمری مدظلہ العالی کی علمی خدمات کا خصوصی تذکرہ کیا۔

کلیدی خطبہ امیر جماعت اسلامی ہند وصدر ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری نے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام کے پاس تہذیب وسیاست کا اپنا نظام ہے۔ وہ اپنی فکر اور نظام کی بنیاد پر دیگر تہذیبوں پر اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اسلامی اصول سیاست و حکومت کے ذریعہ حقوق کی ادائیگی، فساد کے خاتمہ، معروفات کے فروغ، برائیوں کے

ازالہ اور عدل کے قیام کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔

مہمان خصوصی جناب نصرت علی، جنرل سکریٹری جماعت اسلامی ہند نے کہا کہ آج دنیا اسلامی تہذیب اور سیاست کو ایک خطرہ اور چیلنج کے طور پر پیش کر رہی ہے، حالاں کہ اسلامی تہذیب نفع بخشی، جواب دہی اور ایک خدا کے تصور سے عبارت ہے۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، ایڈیٹر ملی گزٹ وصدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ سیاسی غلبہ ہی کسی تہذیب کے پروان چڑھنے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ آپ نے چالیس سال قبل لیبیا میں ایک عالمی سمینار میں اپنی شرکت کے حوالہ سے معروف جرمن دانش ور محمد اسدؒ کا وہ تاریخی جملہ دہرایا کہ ''دنیا کے لیے اسلامی نظامِ حیات اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس کا ماڈل یا عملی نمونہ نہ دیکھ لے''۔

اس اجلاس کی نظامت کے فرائض رفیق ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی نے ادا کیے۔

پہلا اجلاس:

افتتاحی اجلاس کے معاً بعد پہلا علمی اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ڈائرکٹر یو جی سی، اکیڈمک اسٹاف کالج اے ایم یو علی گڑھ نے کی۔ اس میں چار مقالات پیش کیے گئے۔

جناب ابو متین، حیدرآباد نے 'تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار' کے موضوع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سید قطب شہیدؒ اور فواد سیزگینؒ کے افکار کی روشنی میں ان پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کیا جن میں موجودہ مغربی تہذیب نے انسانوں کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی، ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، اے ایم یو، علی گڑھ نے 'اسلامی تہذیب اور مغربی چیلنجز' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے وضاحت کی کہ اسلامی تہذیب نے دنیا کی دیگر تہذیبوں کو مٹایا نہیں ہے، بلکہ ان کے صالح عناصر کو قبول اور فاسد عناصر کو رد کیا ہے، جب کہ مغربی تہذیب اپنے غلبہ کے نشے میں اسلامی تہذیب کو پوری طرح ملیا میٹ کرنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید بٹ، کشمیر

یونیورسٹی نے 'جمہوریت اور اسلامی شورائیت: ایک تقابلی مطالعہ' کے عنوان سے انگریزی زبان میں مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے مغربی نظریۂ جمہوریت کے ارتقاء اور اس کے مادر پدر آزاد اصول ومبادی کا خلاصہ پیش کیا اور اسلامی اصولوں سے ان کا تقابل کرتے ہوئے اسلامی نظریات، اقدار اور اصولوں کی برتری ثابت کی۔ پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی، کشمیر یونیورسٹی کا مقالہ بھی انگریزی زبان میں تھا۔ اس کا موضوع تھا: 'نظریۂ تصادم اور مسلم رد عمل، سعید نورسی کے حوالہ سے'۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مختلف قوموں کے درمیان ڈائیلاگ اور اتحاد صالح بنیادوں پر ہونا چاہیے۔

دوسرا اجلاس

دوسرا اجلاس ساڑھے تین بجے سہ پہر پروفیسر علی محمد نقوی، چیرمین شعبۂ دینیات (شیعہ) اے ایم یو، علی گڑھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں پانچ مقالات پیش کیے گئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی نے اپنا مقالہ 'تہذیب وسیاست کی فکری وعملی تعبیر۔ مولانا علی میاںؒ کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس میں واضح کیا گیا کہ مولانا کے نزدیک تہذیب کی وسعت عقائد، اخلاق اور اعمال سے سیاست وقانون اور بین الاقوامی معاملات، فن تعمیر، شعر وادب اور ذوق لطیف پر محیط ہے۔ انھوں نے ان تمام پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے، لیکن تہذیب وسیاست کے ربط وتعلق کو واضح کرنے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ پروفیسر کنور محمد یوسف امین نے 'مادہ پرست مغرب کا جاری سقوط اور امت مسلمہ پر نیا عالمی خاکہ پیش کرنے کی ذمہ داری' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ مولانا محمد اسماعیل فلاحی، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ کے مقالہ کا عنوان تھا: 'بھارت جیسے کثیر طبقاتی ملک میں تہذیب وسیاست کے کچھ قرآنی اصول'۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا جیل سے رہائی پانے والے ساتھی سے 'وَاذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ' کہنا غیر اسلامی حکومت سے تعاون لینے کا جواز ثابت کرتا ہے۔ انھوں نے ایک غیر اسلامی حکومت میں شامل ہوکر اہم خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ

پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اپنے مقالے میں ہنٹنگٹن کی مشہور کتاب The Clash of civilization میں پیش کردہ نظریۂ تصادم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم میں عقیدہ و کلچر کے تصور کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عمیر انس فلاحی، ریسرچ اسکالر جے این یو، نئی دہلی نے 'تحریک اسلامی : معاصر عہد کا مطالعہ' کے زیر عنوان مسلم دنیا کے متعدد تجربات کا ذکر کرتے ہوئے راشد غنوشی اور علامہ آیت اللہ خمینیؒ کے افکار سے فائدہ اٹھانے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ مابعد مودودی عہد کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

تیسرا اجلاس

تیسرا اجلاس بعد نماز عصر ادارہ کے آڈیٹوریم میں پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں تین مقالات پیش کیے گئے۔

ڈاکٹر محمد راشد اصلاحی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ دینیات (سنّی)، اے ایم یو، علی گڑھ نے 'اسلامی حکومت : قرآن مجید کی روشنی میں' کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر نسیم مرزا کا مقالہ انگریزی زبان میں تھا۔ انھوں نے اسلامی تہذیب کے حوالے سے مریم جمیلہ کی خدمات کا جائزہ لیا۔ انھوں نے بتایا کہ مریم جمیلہ نے اپنی تحریروں میں مغربی تہذیب پر سخت تنقیدیں کی ہیں اور اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ مولانا محمد جرجیس کریمی نے 'اسلام کا سیاسی نظام : محدثین کا نقطۂ نظر' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ کتبِ حدیث کی تدوین عہد عباسی کے عروج کے زمانہ میں ہوئی ہے، لہٰذا ان میں سیاسی ارتقاء کے مقابلہ میں استحکام کے پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

چوتھا اجلاس

چوتھا اجلاس بعد نماز مغرب جناب اعجاز احمد اسلم، رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند و ایڈیٹر ہفت روزہ ریڈینس نئی دہلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب محمد احمد، سکریٹری ملکی و ملی امور جماعت اسلامی ہند، مہمان خصوصی تھے۔ اس اجلاس میں نو مقالات پیش کیے گئے۔

مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، شیخ التفسیر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ نے 'اسلامی نظامِ حکومت قرآن مجید کی روشنی میں' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اسلام کا نظام عالمی ہے۔ وہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور خالق کائنات کا وضع کردہ ہے۔ جناب اشہد رفیق ندوی نے اپنے مقالے میں 'مصر میں اخوان کے ایک سالہ دور حکومت' کا جائزہ پیش کیا۔ جناب مرزا اسجان بیگ نے 'اسلامی نظامِ حکومت قرآن کریم کی روشنی میں' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے حاکمیتِ الٰہ، خلافتِ انسان اور قانون خداوندی کی روشنی میں اولوالامر کے مطلوبہ اوصاف بیان کیے۔ جناب شکیل انور حیدرآباد نے 'اقدار پر مبنی سیاست اور قومی متبادل سیاسی جماعت کی ضرورت' کے عنوان سے اپنے افکار پیش کیے۔ انھوں نے اس موقف کی تائید کی کہ ہندوستان میں اقدار پر مبنی حکومت سازی کے مواقع موجود ہیں، جس سے امت مسلمہ کے افراد کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ دینیات (سنی)، اے ایم یو نے 'مختلف المذاہب معاشرہ اور فریضۂ دعوت' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے تکثیری معاشرے میں دعوت کی اہمیت کو قرآن وسنت سے ثابت کیا اور زور دے کر یہ بات کہی کہ اخلاقی محاسن سے آراستہ ہوئے بغیر دعوت میں تاثیر نہیں پیدا ہو سکتی۔

ڈاکٹر عبدالمجید خان، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو کے مقالہ کا عنوان تھا: 'امت مسلمہ کے مستقبل کا خاکہ'۔ انھوں نے معاصر عہد کی تحریکی سرگرمیوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے مستقبل میں کامیابی کے لیے منصوبہ بندی پر زور دیا۔ پروفیسر وسیم احمد استاد الیکٹرانکس انجینئرنگ، اے ایم یو، نے 'عصر حاضر کی جمہوریت اور قرآنی تعلیمات' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ جمہوریت کے خوش نما دعووں کی قلعی ان ممالک میں کھل چکی ہے جہاں یہ نظام رائج ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو، نے 'سیاست وحکومت کے مسائل اور عہد وسطیٰ کے علمائ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے عہد سلطنت ومغلیہ کے حوالے سے متعدد تہذیبی وسیاسی مسائل کا ذکر کیا، جن میں شریعت کی رہ نمائی میں مسائل کے تصفیے کا رجحان نظر آتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم عہد کے متعدد مسائل میں سلاطین اور

مغل بادشاہوں نے علماء وفقہاء سے رجوع کیا ہے، جس کا ریکارڈ تاریخی دستاویزات میں موجود ہے۔ ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی، معاون مدیر افکارملی نئی دہلی نے 'دنیا کی مسلم اقلیتیں: مسائل اور حل' کو اپنے مقالے کا عنوان بنایا۔ انھوں نے کہا کہ آج امت مسلمہ دنیا کے مختلف خطوں میں ریاستی جبر وتشدد کا شکار ہے۔ انھوں نے عالمی سطح کی مسلم اقلیتوں کے مسائل ومشکلات کے علاوہ خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی، اخلاقی، روحانی، تعلیمی، معاشی اور صحافتی صورت حال کا مطالعہ پیش کیا۔

پانچواں اجلاس

پانچواں اجلاس ۲۴ر فروری کو صبح ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر محمد اقبال مسعود ندوی مقیم حال کناڈا کی زیر صدارت شروع ہوا۔ اس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جامعۃ الفلاح شعبۂ نسواں کے سابق شیخ التفسیر مولانا نظام الدین اصلاحی موجود تھے۔ اس میں پانچ مقالات پیش کیے گئے۔

ڈاکٹر محمد احمد نے 'اسلامی تہذیب و سیاست اور ہندوستانی مسلمان' کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اسلامی تہذیب و سیاست میں بے جا دخل اندازیوں پر نکیر کرتے ہوئے قرآن وسنت اور اسوۂ صحابہ کی طرف مراجعت کو لازم قرار دیا۔ مولانا محمد ناصر قاسمی، ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات (سنّی)، اے ایم یو، نے 'اسلام میں خواتین کے حقوق' کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کا امتیازی کردار یہ ہے کہ اس نے طبقۂ نسواں کو تمام مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی حقوق عطا کیے ہیں۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی، سابق رکن ادارۂ تحقیق نے 'تکثیری سماج میں امت کی سیاسی حکمت عملی' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو الگ سیاسی پلیٹ فارم تیار کرنا چاہیے۔ ملی جلی سیاست ان کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ اسی طرح انھوں نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ مقننہ اور عدلیہ میں مسلمانوں کو اپنی شرکت درج کرانی چاہیے۔

مولانا ظفر دارک قاسمی نے 'اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیت کے معاشی حقوق' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے قرآن وسنت اور اقوال سلف کی روشنی میں اسلام کے عطا کردہ ان معاشی حقوق کا تذکرہ کیا جو اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو

حاصل رہتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد شہاب الدین قاسمی، پروجیکٹ فیلو شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی نے اپنے مقالے میں 'علی عزت بیگووچ کے سیاسی وتہذیبی افکار' کا مطالعہ پیش کیا۔

چھٹا اجلاس

چھٹا علمی اجلاس دس بجے پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت میں معروف ادیب ونقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اے ایم یو، علی گڑھ، نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں پانچ مقالات پیش کیے گئے۔

مولانا مزمل کریم قاسمی سابق اسکالر ادارہ نے علامہ ابن قیم کی تصنیف 'الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ' کا معروضی مطالعہ پیش کیا۔ جناب پرواز رحمانی، مدیر سہ روزہ دعوت نے 'تکثیری معاشرے کے مسائل اور اسلام' کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی حقوق اور ان پر شب خون مارنے کی متواتر کوششوں کا ذکر کیا۔ آپ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا کہ اس ملک میں عقیدۂ توحید اور اسلامی نظام حیات کے مقابلہ میں نظریاتی اور فکری طور پر کوئی مضبوط مزاحمتی قوت موجود نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد عرفان قاسمی کے مقالہ کا موضوع تھا 'الیکشن کی شرعی حیثیت اور ہندوستانی معاشرہ'۔ انھوں نے اب تک اس مسئلہ پر اہل علم کے درمیان جاری مباحثہ کا خلاصہ پیش کیا اور مسلمانوں کو سیاست کے میدان میں متحدہ طور پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کا مشورہ دیا۔ جناب عبدالوہاب التویتی، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، اے ایم یو نے 'مشروعیۃ الانتخابات وطریقتھا فی الاسلام' کے عنوان سے عربی زبان میں مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد خلفاء راشدین کے انتخاب کے طریقوں اوران کی حکمتوں کو بیان کیا۔ انھوں نے امام شوکانی، علامہ ابن تیمیہ اور شیخ عبدالرحمن بن ناصر السعدی کے حوالہ سے اجتماعی مصالح کی حفاظت اوران کی نگرانی کو فرض قرار دیا۔ عبدالسلام حمود غالب، ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات (سنی)، اے

ایم یو نے 'وقفات مع ابن رشد - فکرہ و آراؤہ السیاسیۃ' پر عربی زبان میں مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے مختلف میدانوں میں ابن رشد کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی سیاسی بصیرت کو بطور خاص اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ انھوں نے بتایا کہ ابن رشد سیاست کو سیاست فاضلہ اور سیاست ضالہ کے عنوان سے دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں اور اول الذکر کا بہترین نمونہ خلفاء راشدین کو قرار دیتے ہیں۔

ساتواں اجلاس

ساتواں اجلاس ساڑھے گیارہ بجے مولانا سید حامد عبدالرحمٰن الکاف اصلاحی (صنعائ، یمن) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی پروفیسر سید مسعود احمد، سابق ڈین فیکلٹی آف لائف سائنسز، اے ایم یو تھے۔ اس اجلاس میں پانچ مقالات پڑھے گئے۔

پروفیسر اثمر بیگ، شعبۂ سیاسیات، اے ایم یو علی گڑھ نے 'مغربی لبرل ازم' کی کوکھ سے جنم لینے والے افکار و نظریات کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا۔ آپ نے کہا کہ مغرب نے اپنے نظریات کو Debate سے بالاتر کر رکھا ہے، لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے متعدد چوٹی کے محققین جمہوریت کے کھوکھلے پن کا اعتراف کر رہے ہیں اور لبرل ازم کے نتیجے میں وجود میں آنے والے افکار خود مغرب میں سوالیہ نشان بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، سکریٹری تصنیفی اکیڈمی نئی دہلی نے اپنا مقالہ 'اسلامی نظامِ حکومت پر اعتراضات کا جائزہ۔ علی عبدالرازق کی کتاب الاسلام واصول الحکم کا مطالعہ' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس کتاب میں مصری مصنف نے اسلام کے نظام سیاست و حکومت کا بالکلیہ رد کیا ہے۔ اس بنا پر مسلم دنیا میں شدید بے چینی محسوس کی گئی اور مصر کی 'ھیئۃ کبار العلمائ' کی ۲۴ رکنی کمیٹی نے اس کا رد کیا۔ دیگر مسلم دانش وروں مثلاً ڈاکٹر محمد عمارہ اور طاہر بن عاشور نے اس کا تنقیدی جواب تحریر کیا ہے۔ ہندوستان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی اپنی تصنیف 'مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغرب کی کشمکش' میں اس کا تعاقب کیا ہے۔

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی سکریٹری ادارۂ تحقیق نے 'قرآن مجید کے اصول سیاست و

حکومت‘ کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اسلامی سیاست کے بنیادی اجزاء کی قرآنی آیات کی روشنی میں وضاحت کرتے ہوئے انسان کی خلافت کا معنی ومفہوم اور اصول وشرائط بیان کیے۔ ڈاکٹر شائستہ پروین، معلّمہ شعبۂ دینیات (سنّی)، اے ایم یو کے مقالہ کا موضوع ’خواتین کے سیاسی حقوق‘ تھا۔ انھوں نے علامہ ابن حزم، ڈاکٹر مصطفی سباعی، شیخ عبدالحلیم ابوشقہ اور شیخ محمد الغزالی کے افکار پیش کیے، جنھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلامی ریاست میں عورت حکم راں نہیں بن سکتی، لیکن قانون سازی، مشاورت، عوامی معاملات میں اس کی شمولیت ہوسکتی ہے۔ محترمہ سلمیٰ فردوس، ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات (سنّی)، اے ایم یو نے ’سید قطب شہیدؒ کے سیاسی افکار‘ کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

آٹھواں اجلاس

آٹھواں اجلاس پونے دو بجے جناب پرواز رحمانی مدیر سہ روزہ ’دعوت‘ نئی دہلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں دو مقالات پیش ہوئے۔ مولانا اختر امام عادل قاسمی (سمستی پور، بہار) نے ’اسلامی نظریۂ حکومت اور طریقۂ انتخاب‘ پر فاضلانہ بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ بعثت نبوی کے بعد حبشہ، مکہ اور مدینہ تین مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین سیاسی نمونے امت کے لیے چھوڑے اور ان میں کسی کے نسخ کا فیصلہ نہیں فرمایا۔ اپنے مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے جمہوریت اور شورائیت کے درمیان فرق، اسلام میں حکم راں کی حیثیت، اسلامی نظریۂ حکومت کا امتیاز، شوریٰ، اسلامی طریقۂ انتخاب وغیرہ کے زیر عنوان علماء امت کی آراء کا احاطہ کیا۔ مولانا کمال اختر قاسمی رکن ادارۂ تحقیق نے ’موجودہ پارلیمانی نظام اور شورائیت‘ کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ پارلیمانی نظام کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں قانون سازی کا سارا حق واختیار انسانوں کو تفویض کردیا جاتا ہے۔

اختتامی وتاثراتی اجلاس

اختتامی اجلاس مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی شیخ التفسیر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کی صدارت میں منعقد ہوا، جب کہ مہمان خصوصی مولانا اختر امام عادل قاسمی تھے۔

ابتداء میں محترمہ امامہ سلمیٰ، ناظمہ حلقۂ خواتین جماعت اسلامی ہند مسلم یونی ورسٹی ایریا، جناب عبداللہ عزام، ایس آئی او مسلم یونی ورسٹی یونٹ اور پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی نے اپنے تاثرات پیش کیے اور سمینار کے کامیاب انعقاد پر ذمہ داروں کو مبارک باد پیش کی۔ مہمان خصوصی مولانا اختر امام عادل قاسمی نے فرمایا کہ اس سمینار نے تمام جماعتوں کو سیاست اور تہذیب کے میدانوں میں اسلام کے حقیقی کردار پر سوچنے کی دعوت دی ہے۔

اس موقع پر مولانا سید جلال الدین عمری نے فرمایا کہ اس سمینار نے وقت کے ایک انتہائی حساس موضوع پر عصر حاضر کی زبان میں بحث و گفتگو اور تفہیم کے سلسلہ میں پہل کی ہے۔ ہندوستان کی مخصوص صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ دستور ہند کی رُو سے ہمیں جو آزادیاں میسر ہیں ان کا دعوت و تبلیغ کے لیے بھرپور استعمال ہماری اولین ذمہ داری ہے۔ حالات کو پرامن بنانے اور خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دینے میں ہمیں دیگر باشندگان ملک کا تعاون کرنا چاہیے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ڈائرکٹر شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ اور صدر ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ نے اس بات پر زور دیا کہ اسلامی موضوعات و افکار کو معاصر زبان و اسلوب میں پیش کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے اپنی صدارتی گفتگو میں فرمایا کہ برصغیر کی دیگر جماعتیں سیاست کو آج تک اپنا موضوع نہیں بنا سکیں۔ اس لحاظ سے جماعت اسلامی ہند کا یہ تحقیقی ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے۔

آخر میں کنوینر سمینار ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے تمام مقالہ نگاران، مہمانان گرامی، علمائے کرام، دانش وروں اور شرکائے سمینار کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اے ایم یو کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ملک کے مختلف دینی مدارس کے اساتذہ اور علمی مراکز کے محققین اور بیرون ملک مقیم بعض ہندوستانی اہل علم کی شرکت نے سمینار کو اور زیادہ پروقار اور بارونق بنادیا ہے۔

مولانا سید جلال الدین عمری صدر ادارہ کی دعا پر سمینار کا اختتام ہوا۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

توضیحی اشاریہ تفسیر تدبر قرآن منظور حسین عباسی

ناشر: فاران فاؤنڈیشن، A-۱۹، ایبٹ آباد روڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۷۴۲، (بڑی تقطیع)، قیمت درج نہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (م ۱۹۹۷ء) کی تفسیر تدبر قرآن کا شمار اردو زبان میں موجودہ دور کی اہم تفسیروں میں ہوتا ہے۔ یہ فکرِ فراہی کی نمائندہ تفسیر ہے، جس میں مولانا حمیدالدین فراہیؒ (م ۱۹۳۰ء) کے تصورِ نظم قرآن اور دیگر تفسیری اصولوں کی بھرپور رعایت کی گئی ہے۔ قدیم آسمانی صحیفوں سے استفادہ، کلامِ عرب سے استدلال، اسالیبِ قرآن کی بھرپور توضیح، تفسیری نکات کی عقدہ کشائی اور آیاتِ قرآنی کے ادبی و بلاغتی پہلوؤں کی وضاحت اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ یہ تفسیر نو جلدوں اور تقریباً چھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یوں تو اس کی اولین اشاعت ہی سے ہر جلد کے آخر میں فہرستِ مضامین شامل کی گئی ہے، لیکن اس کے مختصر ہونے کی وجہ سے اس سے موضوعات و مباحث کی جزئی اور تفصیلی معلومات نہیں حاصل ہو پاتی تھیں۔ اس کے لیے جناب محمد نعمان علی نے ایک اشاریہ تیار کیا تھا، لیکن وہ بھی مختصر تھا۔ اب زیرِ نظر کتاب کی صورت میں اس کا مبسوط اور جامع توضیحی اشاریہ مرتب کیا گیا ہے۔

فاضل مرتب نے یہ اشاریہ جلد وار نہیں، بلکہ نفسِ مضمون کی رعایت سے مرتب کیا ہے، البتہ کہیں کہیں استثنائی صورتیں بھی ہیں کہ بعض مباحث کا تذکرہ جلدوں یا سورتوں کی ترتیب سے کیا ہے۔ انھوں نے انیس (۱۹) عناوین قائم کیے ہیں: (۱) اسالیبِ کلامِ الٰہی (۲) استفادہ کے مآخذ: اس کے تحت قدیم آسمانی صحیفوں، احادیث اور کلامِ عرب کے حوالے الگ الگ مرتب کیے ہیں۔ (۳) اسماءِ حسنیٰ (۴) اعتراضات: اس کے تحت یہود اور مشرکین کے علاوہ مستشرقین کے اعتراضات کا بھی تذکرہ ہے (۵) الفاظ و ترکیبات (۶) اماکن (۷) تحریفاتِ تورات (۸) ذاتِ باری تعالیٰ (۹) رسالت مآب ﷺ (۱۰) سننِ الٰہی (۱۱) سوالات: اس کے تحت دو سو سے زائد ایسے سوالات کے حوالے ہیں جو دورانِ تفسیر قاری

کے ذہن میں پیدا ہوسکتے ہیں۔ (۱۲) شخصیات و اقوام (۱۳) فقہی اشارات (۱۴) کتب: اس کے تحت تورات، انجیل، زبور، قرآن، کتب تفسیر و حدیث اور دیگر کتب کے حوالے ہیں۔ (۱۵) مشکلاتِ قرآن: اس کے ذیل میں ان مشکلات کے حوالے ہیں جنھیں مولانا اصلاحی حل نہیں کرسکے ہیں۔ (۱۶) موجودہ مسلمانوں سے خطاب (۱۷) موضوعات (۱۸) نظام القرآن (۱۹) نقطۂ نظر: اس کے تحت تین سو سے زائد ایسے مقامات کا حوالہ ہے جہاں مولانا اصلاحی نے دیگر مفسرین سے اختلاف کیا ہے۔ اس میں ان مقامات کا بھی حوالہ ہے جہاں انھوں نے اپنے استاد امام حمید الدین فراہیؒ سے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔

تفسیر تدبر قرآن کے بارے میں بعض باتیں مشہور ہوگئی ہیں۔ اس کتاب سے ان کی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً بعض حضرات نے لکھا ہے کہ مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر میں احادیث سے بہت کم اعتناء کیا ہے، لیکن اس اشاریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں احادیث کے تقریباً ساڑھے تین سو حوالے موجود ہیں۔ ان میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جن کی طرف صرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ مولانا نے قرآن کریم کے مفردات، اسالیب اور معانی کی وضاحت کے لیے کلام عرب سے خوب استفادہ کیا ہے، لیکن اس اشاریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذکر کردہ اشعار کی تعداد ستّر (۷۰) سے زائد نہیں اور ان میں بھی بیش تر وہ ہیں جنھیں مولانا فراہی اپنی تحریروں میں نقل کرچکے تھے۔ اس اشاریہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی نے پوری تفسیر میں صرف چھ مقامات پر فقہی بحثیں کی ہیں اور وہ بھی بہت مختصر۔

تدبر قرآن پر متعدد پہلوؤں سے تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے، مثلاً اسالیبِ قرآنی کی تفہیم، قرآن کریم اور قدیم آسمانی صحیفوں کے بیانات کا تقابلی مطالعہ، اسماء حسنیٰ کی شرح و وضاحت، مفرداتِ قرآنی کی توضیح، سننِ الٰہی کی تشریح، دیگر مفسرین سے اختلافات کا محاکمہ وغیرہ۔ ان موضوعات پر اس اشاریہ کی مدد سے تدبر قرآن سے مواد جمع کرنے میں آسانی ہوگی۔

فاضل مرتب نے اس توضیحی اشاریہ کی تیاری میں غیر معمولی محنت کی ہے۔ امید ہے، علمی حلقوں میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

حدیث اور علوم حدیث۔ایک مختصر تعارف مرتب: مولانا انیس احمد فلاحی مدنی

ناشر: شعبۂ اعلیٰ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ءصفحات: ۱۹۲، قیمت درج نہیں۔

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ شمالی ہند میں دینی تعلیم کا ایک ممتاز ادارہ ہے۔ اس کی انجمن طلبۂ قدیم جامعہ کے طلبہ میں علمی ذوق پروان چڑھانے کے لیے متعدد تدابیر اختیار کرتی ہے۔ انجمن کی ممبئی یونٹ کے تعاون سے ۲۰۱۳ء میں شعبۂ اعلیٰ کے طلبہ کے سامنے حدیث اور علوم الحدیث سے متعلق گیارہ لکچرس کا انتظام کیا گیا۔ ہر لکچر کے بعد وقفۂ سوالات رکھا گیا، جس میں طلبہ کی جانب سے کیے جانے والے سوالات کے تشفی بخش جوابات دیے گئے۔ آخر میں شرکاء کا مسابقہ جاتی امتحان بھی لیا گیا۔

مذکورہ لکچرس کو مرتب و مدوّن کرکے زیر نظر کتاب کی صورت میں شائع کردیا گیا ہے۔ لیکچر دینے والوں میں جامعۃ الفلاح اور دیگر دینی مدارس کے موقر اساتذۂ حدیث ہیں۔ لیکچرس کے عناوین یہ ہیں: علوم الحدیث۔ ایک تعارف، قرآنی نظام کی تشکیل میں سنت کا کردار، سنت کا تعلق حدیث سے، فن حدیث کی کتابوں کی قسمیں، فن تخریج: آغاز اور ارتقائ، درایۃ الحدیث، کتب ستہ اور ان کی خصوصیات، عربی زبان و ادب پر حدیث کا اثر، شیعہ اور حدیث، مستشرقین اور حدیث وغیرہ۔

علوم الحدیث پر یہ کتاب دینی مدارس کے طلبہ اور عام شائقین کے لیے مفید ہے۔ توقع ہے کہ اس طرح کے موضوعات پر آئندہ بھی لکچرس کا اہتمام کیا جائے گا۔

(م۔ر)

جنائز (میت کے جامع مسائل) مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ
ترجمہ وتلخیص: مسعود احمد الاعظمی

ناشر: دارالثقافۃ الاسلامیۃ، مئوناتھ بھنجن (یوپی) ۲۰۱۲ءصفحات: ۱۰۴، قیمت -/۵۰روپے

ہندوستانی علماء میں محدثِ عصر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (م ۱۹۹۲ء) بلند مقام کے حامل تھے۔ انھوں نے متعدد قدیم مراجعِ حدیث کی تحقیق و تدوین کی خدمت

انجام دی ہے، مثلاً مسند حمیدی، کتاب الزہد والرقائق، سنن سعید بن منصور، مصنف عبدالرزاق، کتاب الثقات لابن شاہین وغیرہ۔ میدان فقہ میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ عالم اسلام کے جلیل القدر علماء مثلاً شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ، شیخ عبدالحلیم محمود سابق شیخ الازہر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر یوسف القرضاوی رحمہم اللہ نے انھیں زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے اور حدیث وفقہ میں ان کی خدمات وسراہا ہے۔

کویت کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ نے بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں الموسوعۃ الفقہیۃ کے نام سے ایک عظیم الشان فقہی پروجکٹ تیار کیا تھا۔ اس کے تحت مولانا اعظمی کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ کویت میں کچھ عرصہ قیام کرکے اس پروجکٹ میں تعاون کریں۔ بعض موانع کی وجہ سے مولانا اس پیش کش کو تو قبول نہ کرسکے، لیکن انھوں نے 'الجنائز' کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ، جو تقریباً سو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل تھا، پروجکٹ کمیٹی کو ارسال کردیا تھا۔ زیر نظر کتاب تلخیص کے ساتھ اس کا ترجمہ ہے۔ یہ خدمت مرحوم کے نواسے مولانا مسعود احمد الاعظمی نے انجام دی ہے۔

اس کتاب میں میت سے متعلق تمام احکام ومسائل کا احاطہ کیا گیا ہے، مثلاً غسل، تکفین، جنازہ اٹھانا، نماز جنازہ، قبر، تدفین، زیارتِ قبور وغیرہ۔ الموسوعۃ کے لیے مولانا نے جو تحریر تیار کی تھی اس میں تمام مسالکِ فقہ کا بیان تھا، لیکن ترجمہ میں صرف فقہ حنفی کی تفصیلات دی گئی ہیں، دیگر مسالکِ فقہ کے تذکرہ کو حذف کردیا گیا ہے۔

احکام الجنائز سے متعلق یہ ایک مفید رسالہ ہے۔ امید ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ (م-ر)

افکارِ مجیب مرتب: ڈاکٹر عبداللہ عمار رشادی

ناشر: مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ سینٹر، رشادنگر، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص ۴۰۰، قیمت -/۳۵۰ روپے

مولانا مجیب اللہ ندوی (م ۲۰۰۶ء) کی خدمات متنوّع ہیں۔ انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستگی کے زمانے میں بلند پایہ تحقیقی کتابیں تصنیف کیں، جن میں

'اہل کتاب صحابہ وتابعین' اور 'تبع تابعین' (اول) مشہور ہوئیں۔ بعد میں دینی تعلیم کا ایک ادارہ 'جامعۃ الرشاد' کے نام سے قائم کیا اور ماہ نامہ الرشاد کے نام سے ایک علمی مجلہ جاری کیا۔ فقہ میں آپ کا علمی کام معیاری اور قابل قدر ہے۔ اسلامی فقہ (تین جلدیں) فتاویٰ عالم گیری اور اس کے مؤلفین، فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل، اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام اور اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اسلامک فقہ اکیڈمی، ملی کونسل، دینی تعلیمی کونسل جیسے اداروں کے تحت وہ عملی میدان میں بھی بہت سرگرم تھے۔ ان کے صاحب زادے ڈاکٹر عبداللہ عمار رشادی نے ان کی یاد میں ایک علمی وتحقیقی ادارہ مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس کے زیر اہتمام مولانا کی حیات وخدمات پر مارچ ۲۰۱۲ء میں ایک دو روزہ سمینار دارالمصنفین کیمپس میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں پیش کردہ مقالات کا مجموعہ زیر نظر کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

یہ مجموعہ فاضل مرتب کے دیباچہ اور خطبۂ استقبالیہ، مولانا سید محمد رابع ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے پیغام، مولانا محمد نظام الدین امیر شریعت، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے تاثرات اور مولانا عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور کے کلیدی خطبہ کے علاوہ تینتیس (۳۳) مقالات پر مشتمل ہے۔ مقالہ نگاروں میں ملک کے معروف اہل قلم شامل ہیں، مثلاً پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر محسن عثمانی، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مولانا نعیم الدین اصلاحی، پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، مولانا محمد عارف عمری وغیرہ۔ ان حضرات نے مولانا کی علمی ودینی، ملّی، تعلیمی اور دیگر خدمات پر روشنی ڈالی ہے، ان کی تصانیف کا تعارفی مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے اور معاصر شخصیات اور دینی وملی اداروں سے ان کے ربط وتعلق کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں سمینار کی اجمالی رپورٹ اور اس میں منظور کردہ تجاویز کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

اس مجموعۂ مقالات کی صورت میں مولانا مجیب اللہ ندوی کی علمی ودینی خدمات پر اچھا مواد جمع ہو گیا ہے۔ امید ہے، آئندہ ان پر تحقیقی کام کرنے والوں کو اس سے بھرپور مدد ملے گی۔

(م۔ر)

عرب و ہند کی علمی و ادبی خدمات (مجموعۂ مقالات) ڈاکٹر محمد عتیق الرحمان

ملنے کا پتا: مرکز تحقیقات اسلامی گلشن عتیق نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ، سن اشاعت، ۲۰۱۳ء، صفحات: ۳۰۰

یہ کتاب اصلاً مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل چند اہم مقالات یہ ہیں:

عباسی عہد میں عربی نعت نویسی، جدید عربی شاعری میں جب ایمان کی بہار آئی، ۱۹۵۲ء کے بعد مصر کی سماجی ناول نگاری، عربی ادبیات میں علمائے ہند کی چند اہم خدمات (مخطوطات کی روشنی میں)، نواب صدیق حسن خاں اور ان کی نعت نویسی، شیخ عبدالعزیز میمنی علم و تحقیق کی روشنی میں، ہندوستان میں عربی زبان کے ادبی نصوص کی تدوین و تحقیق، مولانا مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم - سیرت اور ادب و انشاء کی روشنی میں، مخطوطہ شناسی - کیوں اور کیسے؟ عرب و ہند تعلقات کے فروغ میں مخطوطات حدیث کا رول اور موجودہ عرب و ہند تعلقات کے فروغ میں ترجمے کی ضرورت و اہمیت۔ مقالات کا یہ مجموعہ بظاہر غیر مربوط ہے، مگر موضوعات کے تنوع اور اعلیٰ تحقیقی معیار کی وجہ سے کافی مفید اور کارآمد ہے۔ فاضل مقالہ نگار معروف عالم دین اور صاحب قلم ہیں اور ملک کے ایک مؤقر ادارے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے کافی عرصہ وابستہ رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی نظر وسیع ہے اور تحقیقات میں گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے۔ اس کے سبب یہ مجموعہ قابل قدر ہے۔ یہ مقالات موصوف نے ملک کے مختلف علمی و ادبی سمیناروں میں پیش کیے تھے۔ ان کی افادیت کے پیش نظر انھیں کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ عربی لغت نویسی میں عربوں کے تذکرے کے ساتھ بعض جیّد علماء ہند کا تذکرہ اور ان کی ادبی خدمات عرب ممالک اور ہندوستان کے درمیان ثقافتی روابط کی استواری کا کام کرتی ہیں۔ دیگر مقالات بھی عمدہ اور تحقیقی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ محمد حسین ہیکل اور منشی پریم چند کا تقابلی مطالعہ بھی عمدہ کوشش ہے۔ مولانا آزاد بلگرامی کے حوالے سے ہندی ادب کا مطالعہ، نواب صدیق حسن خاں کی لغت نویسی اور خدا بخش خاں کی علمی و ادبی دلچسپی جیسے مضامین نے مجموعہ کو اور قیمتی بنا دیا ہے۔ مجموعی طور پر کتاب قابل مطالعہ ہے اور علمی و ادبی ذوق کے فروغ کے لیے مفید ہے۔ (محمد جرجیس کریمی)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۵۱)

☆ صدر ادارہ و امیر جماعتِ اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری کی تصنیف 'اسلام۔ انسانی حقوق کا پاسبان' کو علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اب اس کا تلگو ترجمہ معیاری طباعت اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تلگو اسلامک پبلی کیشنز ٹرسٹ حیدر آباد سے شائع ہوا ہے۔ صفحات: ۱۵۸ قیمت -/۹۰ روپے۔ حیدر آباد بک فیر دسمبر ۲۰۱۳ء میں کے۔ وینکٹیش راؤ سابق چیر مین تلگو اکیڈمی آندھرا پردیش کے ذریعے اور وجے واڑہ بک فیسٹول جنوری ۲۰۱۴ء میں جناب ملا ہزرتیّا (جو وجے واڑہ کی مشہور شخصیت اور آر ایس ایس کے ذمہ دار ہیں) کے ذریعے اس کا اجراءعمل میں آیا۔

☆ اسلامی معاشرت مولانا عمری کی دل چسپی اور تحقیق کا خاص موضوع ہے۔ اس پر ان کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں 'اسلام کا عائلی نظام' اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے 'اسلام کی پاری وارک ووستھا' کے نام سے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ صفحات: ۱۹۲، قیمت -/۱۰۰ روپیے۔

☆ مورخہ ۲۳۔۲۴ فروری ۲۰۱۴ء کو ادارۂ تحقیق کے زیر اہتمام 'تہذیب و سیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار' کے مرکزی موضوع پر ایک سمینار منعقد ہوا۔ اس میں ملک کے مختلف مقامات سے علمائے دین اور اربابِ دانش شریک ہوئے۔ مجموعی طور پر دس اجلاسوں میں چالیس سے زائد مقالات پیش کیے گئے۔ مقالات پیش کرنے والوں میں ادارہ کے اراکین بھی تھے۔ (سمینار کی مفصّل رپورٹ الگ سے پیش کی جارہی ہے)۔

☆ سمینار کے دوران تین نئی کتابوں کا اجراءعمل میں آیا: (۱) اسلام کی پاری وارک ووستھا (مولانا سید جلال الدین عمری) (۲) قرآنی مطالعات۔ سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کے حوالے سے (پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی) (۳) ہم جنسیت کا فتنہ (ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی)۔

☆ ادارہ کے کیمپس میں ایک مسجد کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جارہی تھی، جو اطراف میں رہنے والے بچوں کی دینی تعلیم کے علاوہ دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کا بھی مرکز بن سکے۔ بعض اصحاب خیر کے مالی تعاون سے اس ضرورت کی تکمیل ہوئی اور ادارہ کی مرکزی

عمارت سے متصل ایک خوب صورت مسجد کی تعمیر ہوگئی ہے۔ دورانِ سمینار اس کا افتتاح ۲۳/فروری ۲۰۱۴ء کو مولانا عمری کے ذریعے نمازِ مغرب کی امامت سے ہوا۔ اس کے بعد مسجد ہی میں مختصر جلسہ ہوا، جس میں مولانا نے تعمیر مسجد کی فضیلت واہمیت بیان کی۔

☆ ادارہ کے کانفرنس ہال میں مؤرخہ ۳۰/مارچ ۲۰۱۴ء کو ایک توسیعی خطبہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں پروفیسر کنور محمد یوسف امین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے 'زوال پذیر عالمی مغربی نظام کا متبادل' کے عنوان سے اظہارِ خیال کیا۔ خطبہ کے بعد بعض سامعین کی طرف سے سوالات کیے گئے، جن کے فاضل خطیب نے جوابات دیے۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر سید مسعود احمد، سابق صدر فیکلٹی آف لائف سائنسیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے فرمائی۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ وطلبہ اور شہر کے اصحاب ذوق بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

☆ مورخہ ۲۸/مارچ ۲۰۱۴ء کو رائٹرس فورم کا پروگرام منعقد ہوا، جس میں ادارہ کے زیر تربیت اسکالر مجتبیٰ فاروق نے 'محمد اسد: ایک مفکر، ایک مصلح' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ شرکاء نے بعض سوالات کیے اور مقالہ کو بہتر بنانے کے سلسلے میں تجاویز پیش کیں۔

☆ مجلہ تحقیقات اسلامی کو الحمد للہ علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے اور محققین اسے مرکز توجہ بنارہے ہیں۔ ڈاکٹر احسان اللہ فہد، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ دینیات (سنّی) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے رابطہ ادب اسلامی ہند کے علمی مذاکرہ منعقدہ جرئیل انٹرنیشنل اسکول کلکتہ ۱۴-۱۶/دسمبر ۲۰۱۲ء میں مقالہ پیش کیا، جس کا موضوع تھا: 'سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ اور اس کی علمی و دینی خدمات'۔ اسی طرح انھوں نے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں صوفی ازم پر منعقدہ سمینار مورخہ ۱۸-۱۹/مارچ ۲۰۱۳ء میں بھی مقالہ پیش کیا، جس کا عنوان تھا: ''ہندوستان میں اسلامی تصوف کا مطالعہ: تحقیقات اسلامی کے مباحث کا تجزیہ'' اور ابھی حال میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ ٹرانسلیشن اسٹڈیز میں جناب عبدالودود نے اپنے ایم فل کے مقالہ کے لیے موضوع منتخب کیا ہے: 'تحقیقات اسلامی میں شائع شدہ تراجم کا تجزیاتی مطالعہ'۔

☆ مورخہ ۱۶/جنوری ۲۰۱۴ء کو ادارہ کی مجلس عاملہ کی نشست اور مورخہ ۲۰/مارچ ۲۰۱۴ء کو مجلس منتظمہ کی نشست دہلی میں منعقد ہوئی۔ ان میں ادارہ کی سرگرمیوں اور مسائل کا جائزہ لیا گیا اور علمی وانتظامی شعبوں سے متعلق متعدد فیصلے کیے گئے۔

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI

ALIGARH

Vol. 33 No.2

April–June 2014

Editor

Syed Jalaluddin Umari

Asst. Editor

Mohammad Raziul Islam Nadvi

mrnadvi@yahoo.com

Nabi Nagar (Jamalpur) P.O. Box: 93

ALIGARH – 202 002 (INDIA)

www.tahqeeqat.net

Email: tahqeeqat@gamil.com

CONTENTS

1. **Sperm Bank: Concept, Problems and Islamic Perspective** 5
Dr. Mohammad Raziul Islam Nadvi

2. **Ratiocination from Earlier Shariahs and Stand of Imam Bukhari** 25
Abdul Ghaffar

3. **Judicial Immunity of Rulers** 39
(An Analysis in the Light of Islamic Teachings)
Maqbool Hassan

4. **Maulana Habiburrahman Ludhianwi and Majlise Ahrare Islam** 55
(An Analysis of National and Political Contribution)
Dr. Mohammad Irfan Qasmi

5. **A Comparative Study of Principles of Logical Interpretation of Imam Raghib Isfahani and Maulana Farahi** 75
Dr. Mohammad Yusuf al-sharbaji
Tr. Maulana Abu Sad Azmi

6. **Backbiting – a Crime Graver than Adultery** 97
Dr. Sirajul Islam Haneef

7. **A National Seminar on The Role of Islam to Build Culture and Politics** 103
Dr. Ziauddin Malik Falahi

8. **Book Reviews** 113

9. **Activities of Idara Tahqee-o-Tasneef-e-Islami** 119

Abstract of the Articles

Sperm Bank

Concept, Problems and Islamic Perspective

Dr. Mohammad Raziul Islam Nadvi
Secretary Tasnifi Academy JIH, New Delhi
Email: mrnadvi@yahoo.com

In the modern time extraordinary and amazing advancements of medical science have created a lot of problems, whereby the family system is faced with disaster and its fabric is being disintegrated. Among these, sperm banks, artificial insemination and sperm donation are worth mentioning. Sperm banks mean medical institutions that collect the semen of donors and save it after separating the sperms and freezing them. A woman who wants to have a baby can receive it from there and get fertilized artificially with it in order to deliver a baby after the passage of a specific period of pregnancy. Sperm banks started functioning in the west four decades ago. But in this very short period it got popularity and many centres have been established for it in most of the countries.

The concept of sperm bank is a product of pure western culture. In the west it has affected the stability of family seriously. As a result of this the emotional relationship between spouses has come to a standstill and the concept of genetic relationship become out-dated. The wide popularity it has gained in the west gives way to the apprehension that in future babies will be produced in an artificial way and a trade of human beings will start in the international market.

In Islam the only way of progenition is Nikah. In the eyes of Islam artificial insemination is permitted only in some special conditions. But for this the sperm and ovum used should be of the persons living together by virtue of Nikah. Likewise, after the death of husband it is not permissible for his wife to get fertilised with the sperm of her husband preserved in the sperm bank.

Ratiocination from Earlier Shariahs and Stand of Imam Bukhari

Abdul Ghaffar

Subject Specialist, Islamic Studies

Govt. College for Elementary Teachers, Kot Lakhpat, Lahore, Pakistan

Earlier shariahs mean the commands Allah had sent to earlier nations (Jews/ Christians) through their respective prophets to convey to their followers. Among them the commands which are not mentioned in Islamic Shariah or are mentioned therein but have been categorically declared null and void do not hold any reason for Muslims. But the commands (of earlier shariah) which have been made mandatory for Muslims as well are indeed points of reason.

As far as the commands of earlier shariahs which are mentioned in the Quran and Hadith, but neither accepted or rejected, viz. there is no clear statement about their being obligation or nullification, scholars differ in holding such commands as having reason in the Islamic Shariah. Some scholars do not accept it as a reason, but the majority of them accept it as such.

Imam Bukhari has mentioned some traditions in his 'Sahih' related to the earlier shariahs and made headings thereof, making his viewpoint clear that he holds such commands of earlier shariahs as reasonable for the Muslim Ummah as well.

In this article five examples has been cited from Sahih Bukhari to show his viewpoint.

Judicial Immunity of Rulers

(An Analysis in the light of Islamic teachings)

Maqbool Hasan

Karachi (Pakistan)

This research paper aims to probe into the concept of Adl (Justice), its status in Islam and to prove that the prevailing concept of judicial immunity of the state rulers is totally unjust and against the teachings of Islam. Injustice and brutality in the society was one main cause of the destruction of the previous nations. Unconditional justice is extremely vital for the establishment of peace and survival of the society.

The Holy Quran and Sunnah lay great emphasis on justice. Islam does not accept any sort of judicial exemption to anyone and enforces the law on everyone without any discrimination. Islam and Shariah Law is above all. There are abundant examples of court trial of Muslim Rulers, including Khulafa-e-Rashideen that they appeared personally before the court and fulfilled the requirement of law.

Rather than non-Muslim world, in the Islamic world there is law of judicial exemption of the rulers. It is completely against the Islamic Shariah and is an open joke with the teachings of Allah the Almighty. Islamic Shariah is above all for a Muslim. Muslim intellectuals and men of power should think on this seriously and try to repeal all these anti-Islamic and unjust laws so that our countries become peaceful places and be examples for non-Muslims too.

Maulana Habiburrahman Ludhianwi and Majlise Ahrare Islam (An Analysis of National and Political Contribution)

Dr. Mohammad Irfan Qasmi

Dept. of Theology (Sunni), Aligarh Muslim University, Aligarh

Indian Muslims faced severe trial after the decline of Mughal Empire. They experienced injustice, tyranny and violence by the British. The English men not only tried to destroy them economically but also attacked their religion and belief. In such circumstances, many personalities associated with different religious and community institutions and groups contributed to save the lives, properties and identity of Muslims. This contribution is the golden chapter in the history of the nation. During this period, the contribution of Majlis-e-Ahrar-e-Islam and its first president Maulana Habibur Rahman Ludhianwi is a very important part of the history of Indian Muslims.

Maulana Habibur Rahman was born on 3rd July 1892 in Ludhiana (Punjab), received his early education at different Madrasas in his native place. For higher education he joined Darul uloom Deoband. Just after completing his education, he started to take part in political activities. He was arrested many times. Maulana was the first president of Majlis-e-Ahrar-e- Islam. From the platform of this organisation he

rendered many important services to the Muslims. Among them Tahreek-e- Kashmir and Tahreek-e-Radde Qadiyaniyat are remarkable. As a result of Tahreek-e- Kashmir the Kashmiris obtained many rights. And with Tahreek-e-Radde Qadiyaniyat the rise of Qadiyaniyat in different regions of the country was restrained. In the areas of Punjab where the followers of Qadiyanism were in large numbers, Muslims were oppressed and hapless and there was a risk of their belief to be shaken. The movement made their belief strong and staunch. They found salvation from tyranny and violence. Maulana died in Delhi in 1956.

This article throws light on the services rendered to the country and the community by Maulana Habibur Rahman Ludhianwi and Majlis-e-Ahrar-e-Islam.

A Comparative Study of Principles of Logical Interpretation of Imam Raghib Isfahani and Maulana Farahi

Dr. Mohammad Yusuf al-Sharbaji

Dr. Maulana Abu Sad Azmi

Research Scholar, Dept. of Arabic, Aligarh Muslim University, Aligarh

Imam Raghib Isfahani and Maulana Farahi, both are great personalities in the field of Quranic exegesis. An incomplete tafseer Jami al Tafaseer and a dictionary of Quran namely Al Mufradaat fi Gharib al Quran by Imam Isfahani are very famous books. Similarly, Maulana Farahi is a very well-known personality in the academic world due to his incomplete Tafseer namely Nizam al Quran wa Taweel al Furqan bil Firqan and some other books on Quranic sciences. Isfahani in the introduction to his tafseer and Maulana Farahi in his book Al Takmeel fi Usool al Taweel have discussed the fundamentals and principles of Taweel al- Qur'ān.

This article presents a comparative study of principles of taweel as envisaged by Isfahani and Farahi. First, there are separate discussions on Usool-e-taweel described by them, followed by unanimity and differences among them, and that according to both, coherence, reference and context are necessary and unique (shaz) interpretation are negligible. It also shows that explaining the Quranic ayahs on the basis

of weak and unauthentic ahaadith is unacceptable. The best and authentic way to explain the Quranic ayahs is Tafseer al Quran bil Qur'ān, viz. commentary of Quran by Quran itself.

There is a very slight difference between the methods of Isfahani and Farahi. Isfahani tried to give more stress on differences and similarities of literal meaning of Quranic words. On the other hand, Farahi gave more emphasis on coherence.

Backbiting – a Crime Graver than Adultery

Dr. Sirajul Islam Haneef

Asstt. Prof. Dept. of Islamic Studies

Abdul Wali Khan University, Mardan (Pakistan)

An article entitled Gheebat: Aqsaam aur Hudood (Backbiting: Types and Limitations) written by Dr. Zahida Shabnam was published in the Oct-Dec 2013 issue of Tahqeeqat-e-Islami. She describes the depravity of backbiting with the help of Ahaadith as well, but most of the Ahaadith are weak and fabricated. Critics of Ahaadith have raised questions on the narrators of these ahaadith and declared them as unauthentic.

Backbiting is very disgusting. The Quran and Sahih Ahadith are enough to prove its disgust. There is no need to seek the help of weak and fabricated ahaadith. Some of such weak ahaadith have been discussed in this article to prove their weakness.

A National Seminar on The Role of Islam in Building Culture and Politics

Dr. Ziauddin Malik Falahi

Dept. of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, Aligarh

A 3-day seminar on "The Role of Islam in Building Culture and Politics" was held under the auspices of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami Aligarh on 22-24 February 2014. More than 40 papers were read out in eight academic sessions of this seminar. Two papers were in Arabic, four in English and the rest were in the Urdu language. Inaugural and concluding sessions were other than these. Besides paper

presentation and presidential addresses, there were some special addresses as well. The floor was also open for questions and answers, suggestions and reviews. The audience also took part actively and seriously.

The inaugural session was presided by Dr. Zafarul Islam Khan, Editor Milli Gazette and President All India Muslim Majlis-e-Mushawarat. Maulana Sayyid Jalaluddin Umari President of Idara and Ameer Jamaat-e-Islami Hind presented the keynote address. Teachers and research scholars of Aligarh Muslim University, scholars of Kashmir University, Delhi University, Jamia Millia Islamia, teachers of different Madrasas, researchers of academic centres and some Indian academicians living in foreign countries also took part in this seminar. Thus, the seminar received dignity, reputation and trust among the people.

BOOK REVIEWS

1. ***Tauzihi Ishariya Tadabbur-e- Quran*** (Annotated Bibliography of Tafsir Tadabbur-e-Quran by Ml. Amin Ahsan Islahi) compiled by Manzoor Hussain Abbasi; 2013; Pages: 742; Price not mentioned
Reviewed by Mohammad Raziul Islam Nadvi

2. ***Hadees Aur Uloom-e-Hadees Ek Mukhtasar Taaruf*** (Hadith and Sciences of Hadith – A brief Introduction) Compiled by Ml Anees Ahmad Falahi Madani; 2013; pages 192 Price not mentioned.
Reviewed by Mohammad Raziul Islam Nadvi

3. ***Janaez (Mayyit ke Jame Masael)*** (Funerals: comprehensive issues related to dead by Ml. Habibur Rahman Al-Azmi, Translated and abridged by Ml. Masood Ahmad Al-Azmi; 2012, pages 104, Price 50/-
Reviewed by Mohammad Raziul Islam Nadvi

4. ***Afkar-e-Mujeeb*** (Thoughts of Maulana Mujeebullah Nadvi) Compiled by Dr Abdullah Ammar Rashadi; 2013; Pages: 400; Price 350/-
Reviewed by Mohammad Raziul Islam Nadvi

5. ***Arab-o-Hind ki Ilmi-o-Adabi Khidmaat*** (Academic and Literary Contributions of Arab and India) by Dr. Mohammad Atiqur Rahman; 2013; Pages: 400; Price 350/-
Reviewed by Maulana Muhammad Jarjees Karimi

R.No. 38933/81 Quarte ly Mob. 09897655171
Tahqeeqat-e-Islami Phone: 0571-2902034
April.......2014 Aligarh June.............2014

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیاتِ قرآن	۳۰۰/	۲۲	خطبات پاکستان	۱۰۰/
۲	اسلام - انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/	۲۳	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۲/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/	۲۴	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۴	کمزور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵۰/	۲۵	اسلام اور مشکلات حیات	۲۵/
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۰۰/	۲۶	خدا کی غلامی - انسان کی معراج	۱۴/
۶	خدا اور رسول کا تصور - اسلامی تعلیمات میں	۱۴۰/	۲۷	اسلام اور وحدت بنی آدم	۱۶/
۷	معروف و منکر	۱۸۵/	۲۸	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۸	اسلام کی دعوت	۱۵۰/	۲۹	انفاق فی سبیل اللہ	۲۰/
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۸۵/	۳۰	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۲/
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۱	انسانوں کی خدمت - اسلام کی نظر میں	۱۲/
۱۱	عورت - اسلامی معاشرے میں	۱۸۰/	۳۲	جماعت اسلامی ہند- پس منظر خدمات اور طریقۂ کار	۳۵/
۱۲	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۱۰۰/	۳۳	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۸/
۱۳	عورت اور اسلام	۵۰/	۳۴	ملک وملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/
۱۱۴	اسلام کا عائلی نظام	۹۰/	۳۵	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/
۱۵	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۱۵/	۳۶	وقت حساب	۱۵/
۱۶	قرآن کا نظام خاندان	۱۸/	۳۷	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچایئے	۱۰/
۱۷	بچے اور اسلام	۱۰/	۳۸	اسلام کا شورائی نظام	
۱۸	اسلام - ایک دینِ دعوت	۱۰/	۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۵/
۱۹	دعوت و تربیت - اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/	۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/
۲۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت - اہمیت اور تقاضے	۵/	۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/
۲۱	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۸/	۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۰/

ملنے کے پتے:

۱- ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ - ۲

۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی - ۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵